ڈاکٹر وزیر آغا

چوری سے یاری تک

چوری سے یاری تک

(انشائیے)

ڈاکٹر وزیر آغا

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹ع، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲ -

بارِ اوّل : مارچ ۱۹۸۲ء
قیمت : ۱۸ روپے
مطبع : سیما آفسیٹ پریس، دہلی۔

ناشر:
موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

عزیزم پریم گوپال متل!

آپ کا محبت نامہ ملا، تہہ دل سے ممنون ہوں۔ "چوری سے یاری تک" اور "تنقید اور مجلسی تنقید" ——— دونوں ابھی تک بھارت میں شایع نہیں ہوئی ہیں۔ مجھے یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ بھارت میں پہلی بار آپ ہی ان دونوں کتابوں کو شایع کریں گے۔ میری طرف سے اجازت ہے۔

مخلص

۲۷ اکتوبر ۸۱

(وزیر آغا)

عصمت اللہ کے نام

جو اِن میں سے بیشتر انشائیوں کا
موضوع بھی ہے اور محرک بھی!

ترتیب

پیش لفظ	مشتاق احمد یوسفی	۷
(۱) چوری سے یاری تک		۹
(۲) سیّاح		۱۸
(۳) چھینا		۲۶
(۴) جہاں کوئی نہ ہو!		۳۴
(۵) دیوار		۴۱
(۶) طوطا پالنا		۴۹
(۷) میری چالیسویں سالگرہ		۵۷
(۸) واپسی		۶۵
(۹) کچھ ضرب المثل کی مخالفت میں		۷۳

(۱۰) یہ معصوم لوگ ۸۳
(۱۱) کچھ رشتہ داروں کی شان میں ۹۰
(۱۲) درمیانہ درجہ ۹۹
(۱۳) بس اتنی سی بات ہے! ۱۰۸
(۱۴) فُٹ پاتھ ۱۱۶
(۱۵) کچھ قلم کے بارے میں ۱۲۳

پیش لفظ

تقریر ہو یا تحریر، تنقید ہو یا تقریظ، نظم ہو یا انشائیہ، ڈاکٹر وزیر آغا ہر رنگ میں اپنے اندازِ قد سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہلکے پھلکے انشائیوں کا یہ مجموعہ اُن کی رنگا رنگ شخصیت کا عکسِ جمیل ہے۔ اُن کی طبیعت میں جو دلآویز نرمی، رچاؤ اور شائستگی ہے، زہین اور اُس کے رشتوں کو انھوں نے جس طرح چاہا اور نباہا ہے —— وہ ایک ایک سطر سے جھلکتا ہے۔ سخت سے سخت بات کو نرم انداز میں کہنے کا یہ طرز کم ادیبوں کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ لڑتے ہیں، مگر اس سادگی سے کہ اپنی تلوار کو بے نیام نہیں ہونے دیتے۔ مزاح اُن کے لیے سیف نہیں، سپر ہے۔ روزمرّہ کے واقعات و تاثرات کو وہ جس زاویے سے دیکھتے ہیں، وہ اُنھی کی روشِ خاص

ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُردو میں وہ اس صنفِ ادب (ایسّے) کے مُوجد بھی ہیں اور خاتم بھی تو بے جا نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اِس دور میں جب پڑھنے والوں کو سیروں کے حساب سے بکنے والے ناولوں کا چسکا پڑ گیا ہے، اتنے مُختصر مضامین پڑھنے کی فُرصت کس کو ملتی ہے؟ اور یہ پڑھنے اور لکھنے والوں ـــــ دونوں کی ـــــ کم نصیبی ہے۔

مضامینِ نَو کا یہ مجموعہ اپنی تازگی اور توازنِ فکر و نظر کے لحاظ سے اُردو ادب میں یادگار رہے گا۔ اِس کے چند مضامین جس جریدے میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں، وہ خاصۂ خاصانِ رسائل ہے اور اب جب کہ خاصانِ ادب پر عجب وقت آکے پڑا ہے، یہ خاصے کی چیز تا دیر اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین وصول کرتی رہے گی۔

مشتاق احمد یُوسفی

چوری سے یاری تک

چوری ہمارا پیشہ ہی نہیں، مشغلہ بھی ہے اور ہم نے لیل و نہار کی ہزار کروٹوں کے باوجود نہ صرف اسے زندہ رکھا بلکہ اس میں لاتعداد موشگافیاں اور فنی باریکیاں بھی پیدا کی ہیں۔ دروغ برگردنِ راوی، لیکن یہی سنا ہے کہ ہمارے اس پیشے کا ذکر رگ وید میں بھی موجود ہے۔ آریا جب ہم پر حملہ آور ہوئے اور ہمارے قلعوں کو برباد کرتے چلے گئے تو جواباً اور انتقاماً ہم نے بھی ان کے مویشی چرانے شروع کر دیے۔ وہ سارا دن لڑنے بھڑنے کے بعد جب رات سمے آرام کرتے تو ہم شبخون مار کر ان کے مویشی اُڑا لے جاتے۔ یقین جانو، ہم نے انھیں اس قدر پریشان کیا کہ وہ اپنے اشلوکوں میں برکھا اور دودھ اور فرزند کے لیے دُعائیں مانگنا چھوڑ کر ہمیں بد دُعائیں دینا شروع ہو گئے۔ بے چارے اور کر بھی کیا سکتے تھے، لیکن ان کا ہمیں مکروہ صورت

ناگ کا پجاری اور مویشیوں کا چور ایسے خطاب عطا کرنا خود ان کی بنیادی کمزوری کی ایک دلیل تھا۔ ہمیں اس سے کیا نقصان پہنچ سکتا تھا؟ ذرا سوچو کوئی چاند پر تھوکے تو خود اُس کا منہ کہاں محفوظ رہے گا! بہرحال اپنے تاریخ جغرافیہ کے اُستاد سے پوچھ لو کہ یہ آریا لوگ تھُو تھُو کرتے صفحۂ خاک سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے یا نہیں! لیکن دشمن سے انتقام لینے کا جو شاندار حربہ ہماری تحویل میں آگیا تھا، ہم نے اس سے دست بردار ہونا پسند نہ کیا اور اسے ہر نئے حملہ آور کے خلاف آزماتے رہے۔ چنانچہ ہزارہا برس کے استعمال کے بعد یہ پیشہ ہمارے ساتھ گویا چپک کر رہ گیا۔ آج بھی ہم مویشیوں کی چوری میں خاصے مشّاق ہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی گاؤں میں دو بیگھہ زمین اور ایک بیل لے کر بیٹھ جاؤ۔ اگلی صبح بیل ہمارے گھر پہنچ چکا ہوگا اور دو بیگھہ زمین بدستور تمھاری تحویل میں ہوگی۔ لیکن یہ بھی غلط ہے کہ ہم نے اپنے پیشے کو صرف مویشیوں تک محدود رکھا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم نے اپنے پیشے کو پھیلا کر زندگی اور ثقافت کے سارے کینوس پر محیط کر دیا ہے۔

آریاؤں کا قصّہ ایک بار پھر یاد کرو۔ ہم رات کو تو اُن کے مویشی چُراتے تھے اور دن کو انھیں نئے نئے جھمیلوں میں پھنساتے تھے۔ وہ تھے خانہ بدوش! آج یہاں، کل وہاں! گھوڑوں اور گدھوں کے ساتھ پھرنے والے۔ انھیں

کیا معلوم کہ تہذیب کیا چیز ہے اور زندگی میں رنگا رنگی، رعنائی اور بوقلمونی کیسے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے جب انھیں اپنا ناچ دکھایا تو وہ دم بخود رہ گئے اور جب ناچ اپنے عروج پر پہنچا تو عجب بے ڈھنگے طریق سے خود بھی اس میں شریک ہو گئے۔ ان کی دھما چوکڑی کو دیکھ کر ہم ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔ بھلا یہ بھی کوئی ناچ تھا! —— پھر ہم نے انھیں جوا بازی کی طرف متوجہ کیا۔ ان کی بلا جانے کہ یہ کیا بلا ہے۔ پھر اس کے لیے ذہن کی چمک دمک اور نظر کی تیزی بھی تو چاہیے، جس میں وہ لوگ خیر سے بالکل کورے تھے۔ چنانچہ ہم نے پہلے تو اُن کی دھن دولت، پھر ڈھور ڈنگر اور آخر میں اُن کی بیویاں بھی ہتھیا لیں۔ پرانی کہانیاں پڑھ کر دیکھو کہ ہم نے کس کس موقع پر ہاتھ کی صفائی دکھائی اور شرط لگا کر اُن سے سب کچھ جیت لیا اور وہ ہاتھ ملتے رہ گئے۔ در اصل ہماری تہذیب تو ایک جادو تھا۔ اس میں ایک نشے کی سی کیفیت تھی اور جو کوئی اس کے قریب آتا تھا، پھر اس کے دام سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ سو جب ہم نے انھیں سوم رس پیش کیا تو وہ انکار کر ہی نہ سکے۔ لیکن اسے پی کر اور اس کے نشے میں مبتلا ہو کر انھیں اتنا سرور آیا کہ انھوں نے سوم رس کو اپنے مذہب کا ایک جزو قرار دے لیا اور اپنے دیوتاؤں کو بھی اس کا لالچ دینے لگے۔ جانتے ہو سوم رس کیا ہے؟ اجی، وہی بھنگ جسے تم ذرا پی لو تو پیارے پیارے

خواب دیکھنے لگو۔ آریاؤں نے جب سوم رس پیا تو وہ بھی خواب دیکھنے لگے اور پھر اُن کی ساری خونخواری اور وحشت آنِ واحد میں ختم ہوگئی اور ہم ایک روز انھیں چپکے سے کھا گئے۔ جو اُن میں سے بچ گئے، وہ ساری عمر ہم سے خوفزدہ رہے۔ اُنھوں نے ہماری تہذیب کو ڈائن کا لقب دیا اور کہا کہ جب کبھی ڈائن نظر آئے یا تمھیں عقب سے بُلائے تو پلٹ کر نہ دیکھنا، ورنہ تم پتھر کے بُت میں تبدیل ہو جاؤ گے۔ یہ تو خیر لڑکوں بالوں کو ڈرانے اور منع کرنے کا ایک انداز تھا، ورنہ حقیقت یہ تھی کہ یہ لوگ ہماری تہذیب کے جادو سے مات کھا گئے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ اگر ان میں سے کسی نے ہماری تہذیب کی باس کو ایک بار سونگھ لیا تو پھر اس کے پاؤں مفلوج ہو جائیں گے اور وہ واقعتہً ایک پتھر کے بُت میں تبدیل ہو کر رک جائے گا۔ سُبحان اللہ! ہماری تہذیب بھی کس قدر سندر، نازک اور دل موہ لینے والی تھی! اس کی شکل صورت بالکل ایک سُندر ناری کی سی تھی —— وُہی خوشبو، وُہی رنگ، وُہی تیوَر اور وُہی قدم قدم پر مٹکنے اور سَو سَو بل کھانے کا انداز! بھلا اس کے سامنے کوئی کیسے ٹھہر سکتا تھا؟ آریا جب اس سُندر ناری کے جادو سے عاجز آگئے اور ان کی مدافعت کے حصار میں بڑی بڑی دراڑیں پڑ گئیں تو اُنھوں نے مُسکرا کر اپنی شکست تسلیم کر لی اور اس سُندر ناری ہم کو "مِیت چور" کا لقب عطا کر کے زمیں بوس ہوگئے۔ سوچو، یہی وہ

لوگ تھے جنھوں نے کبھی ہم پر مویشی چرانے کا الزام لگایا تھا، لیکن اب وہ ہم پر دل چرانے کا حسین الزام لگا رہے تھے۔ چور تو بہر حال ہم تھے اور ہمارا یہ لقب ہم سے کوئی چھین نہ سکتا تھا، لیکن 'مویشی' کی بجائے 'چِت' کے لفظ کا استعمال کسی تبدیلی کا غماز تھا؟ سچ پوچھو تو لقب کی یہ تبدیلی ہمارے ثقافتی ارتقا کی نشان دہی کر رہی تھی۔

لیکن یہ ثقافتی ارتقا والی بات بھی کچھ ایسی درست نہیں۔ جانو، جب یہ خانہ بدوش ہم پر نازل ہوئے تو ہم ارتقا کے جملہ مراحل طے کر چکے تھے۔ اگر انھیں ہم لوگ اوّل اوّل مویشی چور اور بعد ازاں چِت چور دکھائی دیے تو ارتقا ان کی نظروں میں ظہور پذیر ہوا نہ کہ ہم میں۔ یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ جب آریاؤں کی آنکھ کھلی تو وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ ہم لوگوں کی تہذیب ان سے کس قدر برتر تھی۔ بہر حال ہماری تہذیب اوّل روز سے چوری کی بنیادی صفت پر استوار تھی اور انشاء اللہ آخر روز تک اسی مسلک پر کاربند رہے گی۔ ہماری ثقافت کی کسی بھی پرت کو اٹھا کر دیکھو، تمھیں اس کے نیچے چوری کی یہ صفت کنڈلی مارے بیٹھی ہوئی ضرور نظر آئے گی۔ تم صبح شام فلمی گیت سنتے ہو، کبھی کبھی دیہاتیوں سے لوک گیت بھی سن لیتے ہو گے۔ یاد کرو، ہمارے گیتوں میں کون سا قومی پرندہ ایک ہیرو کے طور پر ابھرا ہے۔ تم کہو گے کوئل یا مور! ذرا سوچو، کوئل

کے ساتھ تو بس رونا دھونا مختص ہے اور مور کے ساتھ کبھی کبھار کا رقص! ہمارے گیتوں کا اصل ہیرو تو کاگا ہے۔ ہاں، ہاں، وہی کوّا جسے تم گھر کی منڈیر پر بیٹھا دیکھ کر مُنّے کی روٹی کا فکر کرنے لگتے ہو، لیکن یہی کوّا (چوری جس کی ذات میں ہے) ہاں یہی کوّا، کاگا بن کر ہمارے گیتوں میں "مڈل مین" کا مقدّس فریضہ سرانجام دینے پر مامُور ہے۔ آخر جب ایک چور کوئی دھندا شرُوع کرے گا تو لامحالہ دُوسرے چور ہی سے مدد طلب کرے گا۔ اسی لیے ہم نے کوّے کو ایک ہیرو بنا کر پیش کیا ہے اور محبّت کا سارا کاروباری حصّہ اسے سونپ دیا ہے اور کاگا کو دیکھو، اُس نے کس خوش اسلوبی سے پریت کی ہر ریت کو نبھایا ہے اور ساتھ ہی اپنی کاروباری ذہنیت، اپنے بنیا پن کو زائل بھی نہیں ہونے دیا۔

خود ہماری پریت کہانیاں بھی تو چوری کے اس پیشے ہی سے منسلک ہیں بعض دُوسرے دیسوں میں محبّت یا تو شوہر بیوی کی محبّت ہے (بھلا یہ بھی کوئی محبّت ہے!) یا کنواری لڑکی اور کنوارے لڑکے کی محبّت! یہ آخری نمُونہ کچھ زیادہ ہی مقبُول ہے اور اس کے نتیجے میں جو المیہ وجود میں آتا ہے اس سے تم بخوبی واقف ہو، یعنی آخر میں لڑکی لڑکے کی شادی ہو جاتی ہے۔ پھر بچّے پیدا ہونے لگتے ہیں اور ہوتے ہی چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ آخر میں لڑکا ایک روز "بے دانت" کے پوپلے منہ سے کھانستا ہُوا نظر آتا

ہے اور لڑکی اپنے جھرّیوں والے چہرے سے ہر آنے جانے کو بے معنی نظروں سے گھورتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ہے کنواری محبت کا عبرتناک انجام! اصل محبت تو وہی ہے، جس کے ساتھ بعض "سر پھروں" نے "ناجائز" کی صفت ٹانک دی ہے۔ اس محبت میں دو پریمیوں کو نتیجے کی پروا محض اس لیے نہیں ہوتی کہ نتیجہ انھیں پہلے سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ معاملہ ہی زیاں کے لیے کرتے ہیں اور محبّت کے کانٹوں کو جھولیاں بھر بھر کر لوٹتے ہیں۔ غور کرو کہ ہماری تمام پریت کہانیاں محبت کے اس خاص رنگ ہی کی عکاس ہیں اور اسی رنگ نے انھیں زندۂ جاوید بھی کیا ہے ـــــ ہیر اور رانجھا ایک کنواری لڑکی اور لڑکے کے رُوپ میں ملتے ہیں تو بات چُوری پراٹھے سے آگے نہیں جاتی، لیکن جب ہیر کی شادی ہو جاتی ہے اور رانجھا اپنے تن پر بھبھوت مل کر چوری چھپے اُسے ملنے جاتا ہے تو ساری فضا ہی بدل جاتی ہے۔ دفعتہً مطلع ابر آلود ہو جاتا ہے، بجلی کے کوندے لپکنے لگتے ہیں اور کائنات لرزہ براندام ہو جاتی ہے۔ اس سے محبّت میں ایک انوکھی گہرائی اور لذّت پیدا ہوتی ہے۔ بھلا ایسی لذّت "دوگانا" قسم کی محبت میں کہاں؟ ذرا غور کرو کہ ہماری پریت کہانیوں کا سب سے بڑا ہیرو شیام ہے۔ یہ شیام رادھا سے محبّت کرتا ہے اور رادھا ایک بیاہتا عورت ہے۔ شیام رادھے کی محبت چوری چھپے کی محبّت ہے، اور

اسی لیے لذیذ بھی ہے۔ پھر شیام کو چِت چور کے علاوہ ماکھن چور کا نام بھی تو ملا ہے اور غور کرو کہ اس لقب میں پیار کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ محبت میں چوری کا عنصر ہماری ثقافت کا ایک بُنیادی عنصر ہے اور اس پر تم جتنا بھی فخر کرو کم ہے۔ یہاں شاید تم کہو گے کہ رام اور سیتا کی محبت تو بیاہتا محبت تھی، اِس کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ واللہ! تم بھی عجیب ہو۔ رام اور سیتا کی محبّت کو کس کم بخت نے کبھی کوئی اہمیت دی ہے۔ وہ تو ایک سیدھی سپاٹ سڑک تھی، جس پہ دو انسان منہ اُٹھائے بڑھتے چلے گئے۔ اصل قصہ تو اُس وقت شروع ہُوا جب راون نے بیاہی ہُوئی سیتا سے محبّت کی اور اُسے اغوا کر کے لے گیا۔ ہمیں راون کے انجام سے کوئی سروکار نہیں، لیکن غور کرو کہ اگر راون درمیان میں نہ آتا تو اس محبّت کا ثقافتی پہلو تشنہ نہ رہ جاتا؟

اِسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ چوری ہمارا پیشہ ہی نہیں، مشغلہ بھی ہے۔ تم ہمیں چوری سے باز رہنے کا اپدیش دیتے ہو۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ ہم اپنے سارے ثقافتی سرمایے ہی سے قطعِ تعلق کر لیں۔ چوری سے کوئی سروکار نہ رکھنے کا یہ مطلب بھی تو ہے کہ ہم اپنی ذات، اپنی انفرادیت، اپنے مزاج کو تج کر بالکل ننگے ہو جائیں۔ خدارا ایسا کوئی ظلم نہ کرو۔ دیکھو، ہم نے سیاست، ادب، کاروبار اور زندگی کے لاتعداد

دُوسرے گوشوں کو اپنے اِس ثقافتی سرمایے سے کس طرح منوّر کر دیا ہے۔
تم ہمیں وعظ و تلقین سے بے رنگ اور سپاٹ زندگی بسر کرنے کی ترغیب
دینا چاہتے ہو۔ خاطر جمع رکھو، ہم کبھی تمھارے فریب میں نہیں آئیں گے!

سیّاح

ذکر اسی موسمِ گرما کا ہے۔ تاریخ یاد نہیں۔ وقت کا تعین بھی ممکن نہیں۔ بس یوں سمجھیے کہ گرمی کے کسی بدترین مہینے کی بدترین تاریخ کو اسٹیشن ز کے طویل و عریض پلیٹ فارم پر مسافروں کی ٹولیاں اپنے اپنے سامان سے پشت لگائے گاڑی کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ گاڑی حسبِ معمول لیٹ تھی اور میں ان ٹولیوں کے عین درمیان سامان کے ایک بڑے سے "اہرامِ مصر" کے سائے میں ایک سخت جان ٹرنک پر بیٹھا رکھوالی کے آبائی اور مقدس فریضے کی ادائی میں ہمہ تن مصروف تھا اگر یہ سامان کسی ون یونٹ کے نظریے کے تحت مرتب ہوا ہوتا تو ذہنی کوفت میں کمی کے علاوہ رکھوالی کا فریضہ بھی یقیناً آسانی سے سرانجام پا جاتا، لیکن میری بیوی نے بڑے سوچ بچار سے سامان کو لاتعداد

گٹھڑیوں اور پوٹلیوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور اب ان میں سے کوئی گٹھڑی یا پوٹلی اپنی انفرادیت، اپنے وجود اور اپنے "حقِ خود ارادیت" سے دستکش ہونے کے لیے تیار نہ تھی۔ یوں بھی تقسیم کا وصف شاید عورت کی فطرت میں شامل ہے۔ جس طرح دھرتی ایک بیج کو سینکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے اور درخت خود کو لاکھوں شاخوں اور پتّوں میں بانٹ دیتا ہے، بعینہٖ عورت ازل سے اپنے گھر کو کوٹھڑیوں اور سامان کو پوٹلیوں میں تقسیم کرتی آئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ عورت تو اپنے جسم کو بھی ٹکڑوں میں بانٹ دیتی ہے اور یہ ٹکڑے جو مہذّب زبان میں "جگر کے ٹکڑے" کہلاتے ہیں، عورت کے جسم، دامن اور ہینڈ بیگ سے چمٹے "اہرامِ مصر" کے سائے ہیں دُور دُور تک بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ہر باشعور رکھوالے پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی ڈائری میں گٹھڑیوں کی تعداد کے علاوہ ان ٹکڑوں کی تعداد بھی رقم کرے اور پھر ان کی حاصل جمع کو ازبر کر لے تاکہ منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بعد گنتی کے پیچیدہ عمل کو بخوبی سر انجام دیا جا سکے۔ بہرحال اگر عورت تقسیم اور کثرت کے لیے ایک علامت ہے تو مرد جمع اور وحدت کا "سمبل" ہے اور عورت اور مرد کے اس بنیادی فرق کو ملحوظ رکھنا ہر عورت اور مرد کے لیے ازبس ضروری ہے۔

لیکن سرِ دست عورت اور مرد کا یہ بنیادی فرق میرا موضوع نہیں۔

بات یہ ہے کہ موسمِ گرما کی اُس آگ برساتی دوپہر کو جب میں "اہرامِ مصر" کی عظمت کے سامنے خود کو محض ایک نقطۂ موہوم اور اس کی ابدیت کے مقابلے میں خود کو فنا آشنا محسوس کر رہا تھا تو دفعتہً پلیٹ فارم پر بکھرے ہوئے پتھروں، اہراموں اور ابوالہولوں کے شہر سے ایک ہنستا ہوا جوڑا برآمد ہوا اور ہوا کے ایک بے پروا جھونکے کی طرح اٹھکیلیاں کرتا ہوا پلیٹ فارم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بڑھتا چلا گیا اور وہاں ایک کالے سے ہیبت ناک انجن کے پیچھے گم ہو گیا۔ پھر جس طرح ہر جھونکے کے تعاقب میں سوکھے پتے بہت دور تک اُڑے چلے جاتے ہیں، اسی طرح پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوئے مسافروں کی نظروں نے بہت دور تک اس جوڑے کا تعاقب کیا اور پھر ناشاد و نامراد ہو کر اپنے اپنے پاؤں کی طرف جھک گئیں ــــــ وہ دونوں نوجوان تھے۔ قیاس غالب ہے کہ اطالوی تھے اور سیاحت کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ لڑکی نے ایک تنگ سی بے حد خستہ حال پتلون اور بُوشرٹ پہن رکھی تھی۔ اُس کے سر کے بال اُلجھے ہوئے اور گرد آلود تھے۔ چہرہ میک اپ سے قطعاً نا آشنا تھا، البتہ آنکھیں بہت روشن تھیں۔ لڑکے کا لباس بھی اُس کے جسم کے ساتھ بُری طرح پیوست تھا۔ اُس کی سنہری داڑھی جو جنگل کی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، گرد سے کچھ اور سنہری ہو گئی تھی۔ اُس کے بال پریشان

اور بوٹ پھٹے ہوئے تھے۔ لڑکی نے اپنے بازو سے تھرماس لٹکا رکھا تھا اور لڑکے کی گردن سے کیمرہ جھول رہا تھا ـــــ وہ گویا "ٹریول لائٹ" کے جیتے جاگتے اشتہار تھے اور صدیوں کے بوجھ سے آزاد ہو کر خراماں خراماں بڑھتے چلے گئے تھے۔

وہ جب نظروں سے غائب ہو گئے تو میں نے گردن موڑ کر ایک نظر "اہرام مصر" پر ڈالی، جس کے پاس ہی میری بیوی اور بچوں کا کارواں خیمہ زن تھا، اور معاً میرا ذہن عورت اور مرد کے بنیادی فرق سے دامن چھڑا کر سیاح اور مسافر کے فرق پر مرتکز ہو گیا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ مسافر اور سیاح میں تو بڑا فرق ہے! مثلاً یہ کہ سیّاح اپنی مرضی سے اور بقائمیِ ہوش و حواس سفر اختیار کرتا ہے، لیکن مسافر کو بادلِ نخواستہ اس "مصیبت" میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ میری طرف دیکھیے! سفر کرنے سے قبل میں ایک سدا بہار پیڑ کی طرح اپنی زمین اپنی جنم بھومی سے وابستہ تھا۔ میری حالت اس لاڈلے گُل محمّد کی سی تھی جو اپنی جگہ سے حرکت ہی نہیں کرتا بلکہ حرکت کو ناپسند بھی کرتا ہے اور زندگی کی نایاب لذّتیں اور رعنائیاں خود بڑھ کر اُس کے قدموں میں بچھ جاتی ہیں ـــــ صبح سویرے سُورج بطورِ خاص کالے بادلوں کی چلمن کو اُٹھا کر آفتابی شعاعوں سے مجھے نہلاتا۔ پھر نسیمِ صبح کا معطّر جھونکا بڑی لمبی مسافت طے کر کے محض اس غرض سے مجھ

تک آتا کہ میرے جسم کو سُکھلائے۔ اسی طرح بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا میرے لیے کسی دُور دیس سے موتیوں ایسے بارانی قطرے لے کر حاضر ہوتا، لیکن میں کہ روایتی گل محمدؔ کی طرح لاڈلا تھا، خود کبھی کسی حرکت یا جنبش کا مرتکب نہ ہُوا۔ پھر ایک روز اچانک "مجبوری" کا عفریت افق پر نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ بڑا ہونے لگا۔ میں نے اس عفریت سے بے نیاز رہنے کی پُوری سعی کی، لیکن آنکھ میچ لینے کی وہ روایت جو کبوتر سے ہم تک پہنچی ہے، میرے لیے کچھ زیادہ کارآمد ثابت نہ ہو سکی۔ چنانچہ ایک روز عفریت کا سایہ مجھ پر پوری طرح چھا گیا اور میں اس سایے کے نیچے اپنے جیون ساتھی سے رختِ سفر باندھنے کی فرمائش کرنے لگا۔ میری فرمائش پر پہلے تو بیوی حسبِ معمول بڑبڑائی لیکن پھر بچاری مجبُور سی ہو کر ہولے ہولے گھر کے اثاثے کو گٹھڑیوں، پوٹلیوں اور بچّوں میں تقسیم کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد تانگہ منگا لیا گیا اور میں ہنستے ہُوئے بچّوں اور روتی ہوئی بیوی کو ساتھ لیے قریبی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر جا کر خیمہ زن ہو گیا۔ گویا اس سفر کے پسِ پُشت "مجبُوری" ایک کوچوان کی طرح باگیں پکڑے کھڑی تھی اور ان باگوں کا دُوسرا سرا میرے جسم سے بندھا تھا ــــــ لیکن سیّاح کو تو ایسی کوئی مجبُوری نہیں ہوتی۔ وہ کسی خارجی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ ایک اندرُونی اُبال کے زیرِ اثر متحرک ہوتا ہے۔ وہ کسی صبح بیدار ہوتا ہے تو اُسے اپنا ماحول ذرا منجمد اور پھیکا پھیکا

سا نظر آتا ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے گویا وہ ایک زندان میں قید ہے اور اب رہائی کی صرف ایک ہی صُورت باقی ہے یعنی وہ رات کو نقب لگائے اور اپنے ہمسایوں اور قرض خواہوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر راہِ فرار اختیار کرلے ـــــــ اگلی صُبح یہ شخص جو ملک فتح دین ٹمبر مرچنٹ کے نام سے مشہور تھا، اپنے نام اور پیشے سے دستکش ہو کر وقت کی موجوں پر ایک بے نام تیلی کی طرح بہنے لگتا ہے۔ سیّاح کا امتیازی وصف ہی یہ ہے کہ وہ اپنے گھر، وطن، نام اور پیشے سے قطعاً منقطع اور بے نیاز ہو کر کسی غیر مادّی شے کی طرح لطیف اور سُبک ہو جاتا اور بندھنوں اور حد بندیوں کو تج کر ایک آوارہ جھونکے کی سی آزادہ روی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مُسافر کی حالت تو اس پتنگے کی سی ہے جو مکڑی کے جالے میں قید ہو اور جالے کے ایک سرے سے دُوسرے تک اور ایک منزل سے دُوسری منزل تک جالے کی ڈور سے بندھا ہُوا بڑھا چلا جائے، لیکن سیّاح مکڑی کے جالے سے یکسر آزاد ہے۔ گھر کی دیواروں اور منزل کے دھاگوں سے بھی اُسے کوئی سروکار نہیں۔ سیّاح کی کوئی منزل نہیں ہوتی اور نہ کوئی ڈور اُسے کسی خاص سمت میں چلنے پر مجبور رہی کرتی ہے۔ سیّاح تو اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ سیّاح اور مُسافر میں ایک امتیازی فرق یہ بھی ہے کہ مسافر جب سفر پر روانہ ہوتا ہے تو خانہ بدوش کی طرح اپنا کل اثاثہ اپنے ساتھ اُٹھائے جاتا ہے

(چونکہ ریلوے حکّام مُسافر کی نفسیات سے آگاہ نہیں، اس لیے اُنھوں نے بغیر سوچے سمجھے اُسے اپنے ساتھ کم سامان لے جانے کی تلقین کی ہے جو ظاہر ہے کہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی)۔ مسافر تو حرکت کرتے ہوئے بھی حرکت کی نفی کرتا ہے۔ وہ پہلے بھی سماج کے ایک ضروری پُرزے کی حیثیت سے سرگرمِ عمل تھا اور سفر کے دوران میں بھی اپنی اس سماجی حیثیت کو برقرار رکھتا ہے، اپنے ساتھ بوریا بستر، بیوی بچے، پارچات، ٹوکریاں حتّٰی کہ روٹیاں، اچار اور پانی کی صُراحیاں تک لے جانے کی کوشش اس بات پر دال ہے کہ وہ سفر کی حالت میں بھی گھر اور سماج کے تمام دھاگوں کو قائم رکھنے کی آرزو میں سرشار ہے۔ پھر سفر کے دوران میں اخبار پڑھنے، مُسافروں سے بلاوجہ سلسلۂ گفتگو شروع کرنے اور چھابڑی والے سے لڑائی مول لینے کی سعی بھی ایک صحّت مند رُجحان ہے جو اس کے سماجی پہلو کی بقا کے لیے ازبس ضروری ہے۔

دُوسری طرف سیّاح نہ تو سماج کا محافظ ہے اور نہ سامان کا رکھوالا۔ وُہ تو سر سے پاؤں تک ایک "باغی" ہے یا کم از کم سماج کے بندھنوں اور دھاگوں سے متنفّر ضرور ہے اور اب اپنے سماج اور گھر کو چوری چھپے خیرباد کہہ کر کھُلی کائنات میں لمبے لمبے سانس لینے کے لیے نکل آیا ہے۔ چنانچہ وہ خود کو زمین کی کسی شے سے بھی وابستہ نہیں رکھتا۔ پہلے تو وہ "ضروری

ساماں" کو نذرِ نسیاں کرتا ہے۔ پھر اپنے مخصوص لباس، گفتگو اور اندازِ نظر سے دست کش ہو جاتا ہے۔ آخر میں ذات پات، رشتے ناطے اور نام و نمود کے تمام نقوش سے بھی آزاد ہو جاتا ہے اور ملک فتح دین ٹمبر مرچنٹ کے طویل و عریض نام کے بجائے محض ایک "سیّاح" کے نام سے پکارا جانے لگتا ہے۔ چونکہ سیّاح کا لفظ مرتبے، نام اور شخصیت کی نفی کر دیتا ہے، اِس لیے جب وہ سیّاح کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے تو زمین سے منقطع ہو کر اُس غیر ارضی مخلوق میں شامل ہو جاتا ہے جو ہوا کے جھونکے کی طرح سُبک، آزاد اور بے پروا ہے اور جو پلیٹ فارم کے اہراموں اور ابوالہولوں سے کترا کر کسی نامحرم انجن کی اوٹ میں گم ہو جاتی ہے —— گم تو ہو جاتی ہے، لیکن اہراموں کے رکھوالے اپنی پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی اُڑائی ہوئی گرد کو تا دیر دیکھتے رہتے ہیں اور پھر آنکھیں میچ کر اُس تاریکی میں ڈوب جاتے ہیں جو شاید ازل سے اُن پر مسلط ہے اور جو شاید ابد تک اُن کا پیچھا نہیں چھوڑے گی!

چیخنا!

ہنسی آسودگی کے احساس سے جنم لیتی ہے۔ گریہ ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے، لیکن چیخ از سرتاپا ایک احتجاج ہے۔ میں خود ایک خطرپسند طبیعت کا مالک ہوں یا کم سے کم خطرپسندی کا مدّعی ضرور ہوں۔ مجھے آسودگی یا عافیت سے کوئی غرض نہیں۔ میں تو پہاڑ سے ٹکر لینا چاہتا ہوں۔ سمندر سے اُلجھنے، آگ سے کھیل جانے کا آرزومند ہوں۔ اسی لیے مجھے ہنسی ایک نہایت سستی، سطحی اور بے معنی سی بات نظر آتی ہے۔ اوّل تو اس کی مجال نہیں کہ میرے چہرے کو اپنے "غمزۂ پیری" سے مسخ کرنے کی کوشش کرے، لیکن اگر کسی وجہ سے مجھے ہنسی کو اس دخل در معقولات کی اجازت دینی پڑے تو میں اسے زیادہ سے زیادہ ایک نکتہ‌ٹائی کے طور پر استعمال کرتا ہوں۔ بعض افسروں سے

بات کرتے وقت اس کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔ اُس وقت مَیں فوراً جیب سے نکٹائی نکال کر پہن لیتا ہوں اور تبسم میرے چہرے کے ساتھ اُس وقت تک چپکا رہتا ہے جب تک یہ حضرات سامنے موجود رہتے ہیں پھر جب مطلع صاف ہو جاتا ہے تو مَیں اُسی عجلت سے اسے اتار کر دوبارہ جیب میں رکھ لیتا ہوں۔ اگر زیادہ عرصے تک نکٹائی لگانی پڑے تو بعض اوقات تبسم اس بُری طرح چہرے کے ساتھ چپک جاتا ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود اُترنے کا نام نہیں لیتا، لیکن خیر، زندگی میں ایسی اُلجھنیں تو آتی ہی رہتی ہیں اور میں تو ایک بہادر آدمی ہوں۔ میں کیوں ان سے گھبراؤں؟ آخر ہنسی میرا بگاڑ بھی کیا سکتی ہے؟ بس لحظہ بھر کے لیے چہرے کی ہیئت تبدیل ہوتی ہے لیکن اس سے دل کی ہیئت تو نہیں بدلتی! ــــــ ہنسی کی طرح مجھے گریہ سے بھی نفرت ہے۔ عورتوں کی طرح آنسو بہانا کس قدر ذلت کی بات ہے! اور پھر اس میں ایک اعلانِ شکست بھی تو ہے۔ رونے کا مطلب تو یہ ہے کہ اب کوئی اُمید کوئی آرزو، روشنی کی کوئی کرن تک باقی نہیں۔ بس چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ آنسو تو بے بسی کی پیداوار ہیں اور میں کبھی بے بس نہیں ہو سکتا۔ یہ میری "مردانگی" کے خلاف ہے۔ ہنسی اور گریہ دونوں ایک ہی ترازو کے دو پلڑے ہیں۔ ایک خودغرضی کی علامت

ہے اور دُوسرا شکست کا اعلان۔ مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔ میں تو چیخ کا والہ وشیدا ہُوں۔ چیخ، جس میں ایک انوکھی جرأت ایک بے پناہ احتجاج ہے! ٹکر لینے کا ایک انوکھا عزم، متصادم ہونے کی ایک شدید آرزو، دُوسروں کو اپنے وجود کا احساس دلانے کی ایک تیز خواہش ——— یہ ہے چیخ کا منتہا! مجھے چیخ سے بے اندازہ محبت ہے۔

لیکن چیخنا کوئی آسان کام نہیں۔ ہنسی کو لیجیے، ایک حقیر سے واقعہ سے برانگیختہ ہو جاتی ہے۔ اس کی ڈور اکثر ایک معمولی سے مسخرے کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو اپنے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے آپ کے چہرے پر اُتار چڑھاؤ پیدا کر دیتا ہے۔ کیسی شرم کی بات ہے! یہی حال گریہ کا ہے۔ ذرا دل پر چوٹ لگی اور زمین چھلک پڑے۔ لیکن چیخ کسی معمولی تحریک سے وُجود میں نہیں آتی۔ یہ تو صرف زندگی اور موت کے سنگم پر نمودار ہوتی ہے ——— جب ایک طرف موت کا خونی جبڑا ظاہر ہوتا ہے اور دُوسری طرف زندہ رہنے کی ایک شدید آرزو اُبھر آتی ہے۔ اس کی ایک روشن مثال لیجیے! آپ صُبح سویرے سیر کے لیے نکلے ہیں کیونکہ ڈاکٹر نے آپ کو یقین دلایا ہے کہ اگر آپ نے سیر کی عادت نہ ڈالی تو آپ کو جلد ہی ایک طویل سیر کے لیے کمر بستہ ہونا پڑے گا۔ سڑک پر چلتے چلتے آپ کو کسی کوٹھی کے لان میں گلاب کا

ایک شرمایا ہوا پھول نظر آتا ہے (تمثیلی معنوں میں نہیں) اور آپ کی جمالیاتی حس آپ کو مجبور کر دیتی ہے کہ آپ طبعی شرافت اور تہذیبی برتری کو بالائے طاق (جو یہاں بالائے سڑک کے مترادف ہے) رکھ کر اس پھول کی طرف بھونرے کی طرح لپکتے چلے جائیں اور اس سے قبل کہ آپ کی جبلت اور فہم کے مابین تصادم کا آغاز ہو، آپ ایک ہی زقند میں گلاب کی کومل شاخ پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ عین اُس وقت ایک ہلکی سی "وف" کی آواز آتی ہے جو دُوسرے ہی لمحے ایک برہم "گف" میں تبدیل ہو جاتی ہے اور آپ کی حیرت اور خوف سے پھٹی ہوئی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ ایک شیر اتنا بڑا کتا کوٹھی کے برآمدے میں سے آپ کی طرف روایتی بھنورے کی طرح لپکا چلا آ رہا ہے۔ اُس وقت آپ کی آنکھیں سُوئی کی مانند تڑپ کر مقناطیس کی جانب مُڑ جاتی ہیں اور آپ حملہ آور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک ایک قدم پیچھے ہٹنے لگتے ہیں ——— اس طور کہ آپ کو محسوس ہوتا ہے گویا وقت کی پرواز رُک گئی ہے اور آپ کے قدموں کے درمیان گویا صدیاں حائل ہو گئی ہیں۔ دفعتاً آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہے۔ دل اس زور سے دھڑکنے لگا ہے کہ محسوس ہوتا ہے ابھی پھٹ کر باہر آ جائے گا۔ بازوؤں میں تشنج کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور ذہن سے آرٹ، فلسفہ، ادب، تصوف، تہذیب، اور تمدن خس و خاشاک کی طرح

بہہ گئے ہیں۔ پھر اچانک آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی پسپائی اب اپنی آخری حد کو پہنچ گئی ہے اور آپ کی پشت اینٹ کی سخت اور جامد دیوار کے ساتھ جا لگی ہے۔ اب فرار کے تمام راستے مسدود ہیں۔ آپ کے پیچھے سنگ و آہن کی ایک دیوار ہے، آپ کے سامنے خون آلود جبڑوں والی موت ہے اور ان دونوں کے درمیان آپ کا تنِ خاکی ہے جو کسی پُراسرار کیمیائی عمل سے گزر کر اپنی ہیئت تیزی سے تبدیل کر رہا ہے۔ جلد ہی یہ تنِ خاکی خونِ گرم میں بدل جاتا ہے اور خونِ گرم ایک زخمی رُوح میں تبدیل ہو جاتا ہے اور یہ زخمی رُوح ایک کرب انگیز چیخ کا رُوپ دھار لیتی ہے اور زندہ رہنے کی ایک شدید آرزو، مدافعت کی ایک تیز خواہش اور اپنی رہی سہی قوّت کو آخری بار مجتمع کرنے کا ایک بے پایاں عزم بالکل برہنہ ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ اُس وقت آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ کا وجود کسی پُراسرار طریق سے غائب ہو گیا ہے اور اینٹ کی دیوار اور گوشت پوست کے کتّے کے درمیان صرف ایک انسانی چیخ کھڑی ہے ——— چیخ جو آپ کے جسم و رُوح کی واحد محافظ ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اس چیخ کا کتّے کی طبعِ سلیم پر کیا اثر پڑتا ہے اور کہانی کا کاروان کس منزل پر جا کر رُکتا ہے تو یہ بات شریفانہ بحث و تمحیص کے لیے قطعاً موزوں نہیں۔ دیکھنے کی بات تو صرف یہ ہے کہ دلِ ناتواں نے کس جرأت سے مقابلہ کیا اور کس خوبی سے کیا! کامیابی یا ناکامی تو اللہ کے اختیار میں ہے!

لیکن اس ہیجیخ کی نمو کے لیے میں کسی شرماتے ہوئے پھول یا بھونکتے ہوئے کُتّے کا دست نگر نہیں۔ کیونکہ اگر مجھے چیخنے کے لیے کسی غیر معمولی واقعے کا انتظار کرنا پڑے تو پھر چیخنے کے امکانات قطعاً محدود ہو کر رہ جائیں۔ چنانچہ اب مَیں نے سڑکوں پر سیر کرنے کا پروگرام منسوخ کر دیا ہے۔ اس کی بجائے مَیں اب ہر شام کو شہر سے دُور ایک ٹوٹے پھوٹے قبرستان میں جا نکلتا ہوں اور وہاں کمال اطمینان سے "شیر دل خاں" کے کتبے پر بیٹھ کر چیخنے کی مشق کرتا ہوں۔ پہلے آہستہ آہستہ کراہتا ہوں اور پھر قبرستان کے سناٹے میں میری چیخیں بلند ہونا شروع ہوتی ہیں۔ حتّٰی کہ عرفان کا وہ مقام آ جاتا ہے جہاں میرے ہونٹوں سے ایک "الہامی ہیجیخ" نکل جاتی ہے۔ یہ چیخ اس قدر دل دوز ہوتی ہے کہ اسے سنتے ہی قریبی درخت پر بیٹھی ہوئی فاختائیں پھڑپھڑا کر اُڑ جاتی ہیں اور دُور نہر کے کنارے اپنی دُھن میں بڑھتا ہوا مسافر ٹھٹک کر رُک جاتا ہے اور پھر خوف زدہ ہو کر اپنی رفتار تیز تر کر دیتا ہے۔ اگلے ہی روز اس قبرستان کے بارے میں عجیب و غریب افواہیں اُڑنے لگتی ہیں اور لوگ اسے بھوتوں کی بستی کا نام دینے لگتے ہیں۔ لیکن اُنھیں کیا معلوم کہ یہ افواہیں تو محض ان کی بدذوقی کی دلیل ہیں۔ ان کی حقیقت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ کوئی بے قرار رُوح اپنے زنداں کے پہریداروں سے برسرِ پیکار ہے!

مجھے چیخ کی کھردری غنائیت سے والہانہ پیار ہے۔ کسی ہنستے ہوئے شخص کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ خیال آتا ہے کہ یہ شخص اندر سے کھوکھلا ہے۔ روتے ہوئے شخص کو دیکھ کر میں سوچتا ہوں کہ یہ تو محض ایک شمع ہے جو ہولے ہولے پگھلتی چلی جا رہی ہے۔ صرف چند لمحے —— اور یہ شمع پگھل کر ڈھیر ہو جائے گی۔ لیکن چیختا ہوا شخص! چیختے ہوئے شخص کی کیا بات ہے! اُس کا عزم، اُس کا احتجاج، اُس کی آزاد منش ذہنیت، انسانیت کا سرمایہ ہے۔ شاعری میں مجھے مزاحیہ کلام پڑھ کر رونا آجاتا ہے اور المیہ پڑھ کر میں ہنسنے لگتا ہوں۔ لیکن وہ کلام جس میں چیخ پنہاں ہو ایسا کلام پڑھ کر میں خود بھی چیخنے لگتا ہوں۔ ترقی پسند شاعری مجھے اسی لیے پسند ہے —— جب میں خود چیخنے کے موڈ میں نہیں ہوتا یا چیخنے سے مجھے روک دیا جاتا ہے تو پھر دوسروں کی چیخیں سننے کی آرزو میں سرشار ہو جاتا ہوں۔ نجانے لوگ کب چیختے ہیں اور کہاں چیختے ہیں؟ یہ بات معلوم کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ اکثر لوگوں کی چیخ بے آواز ہوتی ہے۔ اس لیے میں اکثر رات کے پچھلے پہر اُٹھ بیٹھتا ہوں اور گھر سے نکل کر قریبی ریلوے لائن کے پاس جا کھڑا ہوتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ رات کے پچھلے حصے میں شور کوٹ سے کوئی یتیم سی گاڑی آتی ہے اور چونکہ اسٹیشن ماسٹر لمبی تانے سو رہے ہوتے ہیں، اس لیے اس گاڑی کا انجن بیرونی سگنل سے باہر کھڑا ہو کر چیخیں مارتا رہتا

ہے۔ اِن چیخوں میں ایک عجیب سی کرب انگیز کیفیت ہوتی ہے جیسے کوئی التجا کر رہا ہو، گھر میں داخل ہونے کے لیے اصرار کر رہا ہو اور گھر کے مالک نے اندر سے دروازہ مقفّل کر لیا ہو۔ مَیں جب اِس چیخ کو سُنتا ہُوں تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور نجانے کیوں مجھے اپنا بچپن یاد آجاتا ہے۔ یقیناً ریل کی اِس چیخ کا میرے بچپن سے کوئی گہرا تعلق ہے، لیکن کیسا تعلق؟ یہ بات مَیں نہیں جانتا!

"جہاں کوئی نہ ہو!"

جب آدھی رات کا گجر بجتا ہے اور آسمان کے آتش دان میں انگاروں ایسے تارے چمک اٹھتے ہیں، جب گم سم درختوں کے نیچے نامراد عاشقوں اور ہارے ہوئے مقدمہ بازوں کی روحیں بین کرتی ہیں اور منڈیر پر بیٹھا ہوا اُلّو ایک تمسخر انگیز ہنسی کے ساتھ ان پر کوئی تیز سا فقرہ کستا ہے، جب چوکیدار اپنی نمک حلالی کے ثبوت میں پہلی اور آخری آواز نکالتا ہے اور ماں کے ساتھ سویا ہوا مُنّا لپک کر آپ کے لحاف میں آگھستا اور آدھے سے زیادہ بستر پر قابض ہو جاتا ہے تو آپ بلّعنت جھنجلا کر اپنے منہ پر سے لحاف ہٹا دیتے اور بستر میں اُٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یکایک آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کی پائنتی کے قریب ایک سفید سا ہیولیٰ کھڑا ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ آپ اپنی بہادری کی ازبر کی ہوئی داستانوں کو فراموش کر کے ایک دل دوز چیخ سے نووارد کا

خیر مقدم کریں؛ وہ مسکراتا ہے اور آہستہ سے کہتا ہے ـــــ "دوست! چیخنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے گلا رُندھ جائے گا، آواز بیٹھ جائے گی اور تم صبح سویرے کی تو تو میں میں کے مقابلے میں بلا وجہ مات کھا جاؤ گے! سنو! میرا نام گوتم بدھ ہے۔ میں ہر شادی شدہ مرد کے دل میں رہتا ہوں اور ہر رات جب ستارے انگاروں کی طرح چمکتے ہیں اور اُلّو وظیفہ پڑھتا ہے تو میں دل کے حجرے سے نکل کر پائنتی کے قریب آ کھڑا ہوتا ہوں اور اپنے دوست کے بیدار ہونے کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ عام طور پر مردوں کی یہ جنس تھک ہار کر سوتی ہے اس لیے رات کے پچھلے حصے میں اتفاق ہی سے بیدار ہوتی ہے اور میرے دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی ہے، لیکن آج اتفاق سے تم بیدار ہو گئے ہو تو اس شاندار موقعے سے فائدہ اٹھاؤ۔ دیکھو، وقت کا کارواں بڑی تیزی سے رواں دواں ہے۔ سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے میں کچھ زیادہ دیر باقی نہیں۔ جلدی کرو، کمبل اوڑھ لو، جوتے پہن لو، بیوی کی پیشانی پر آخری بوسہ ثبت کرو۔ مُنّے کے سر پر آخری بار ہات پھیرو اور آہستگی سے دروازہ کھول کر دبے پاؤں اس گھر، اس شہر، اس دُنیا سے باہر نکل جاؤ! دیکھو، یہ وقت پھر ہات نہیں آئے گا! مایا کی زنجیروں سے نجات پانے کا یہی ایک سُنہری موقع ہے۔ اس سے فائدہ اُٹھاؤ۔ دوست! اگر تم نے ـــــ"

گوتم بدھ کا اُپدیش ابھی جاری ہے کہ آپ کی بیوی نیند میں مُنّے کو ٹٹولتی ہے

اور جب منّا اُس کے ہات کو محسوس نہیں ہوتا تو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتی ہے۔ بیوی کے اُٹھتے ہی آپ غڑاپ سے اپنے بستر میں دبک جاتے ہیں اور گوتم بُدھ لپک کر آپ کے دل میں چھپ جاتا ہے۔ باہر اُلّو ایک تمسخر انگیز ہنسی کے ساتھ آپ دونوں پر کوئی تیز سا فقرہ کستا ہے اور رات مُسکراتی ہوئی ہولے ہولے ڈھلنے لگتی ہے!

شروع شروع میں گوتم بُدھ بنفسِ نفیس آپ سے مُلاقات کے لیے آتے ہیں۔ پھر مایوس ہو کر صرف خواب میں آپ کو نظر آتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد وہاں سے بھی رُخصت ہو جاتے ہیں اور آپ کے پاس صرف گوتم کا عطا کردہ خواب باقی رہ جاتا ہے جو مُنّے کی طرح ہر رات آپ کے لحاف میں آ گھستا ہے اور جسے آپ اپنے سینے سے چمٹائے زندگی کی تاریک راہوں میں بڑھے چلے جاتے ہیں۔ یہ خواب بڑا سُہانا، معصوم اور دلفریب ہے۔ جنّتِ گُم شدہ کو پانے، جنگل کو لوٹنے، اپنی ذات کے حُجرے میں سمٹ جانے کی یہ خواہش کس ذی رُوح کے دل میں موجود نہیں؟ اقبالؔ نے کہا تھا کہ میں دنیا کی محفلوں سے اُکتا چکا ہوں اور اب میری صرف یہ خواہش ہے کہ جنگل ہو، ندی ہو، ایک ٹوٹی پھوٹی کُٹیا ہو، جس میں بیٹھ کر باقی زندگی آہ د زاری میں صَرف کر دوں۔ جنگل اور کُٹیا کی خواہش میں تو کوئی حرج نہیں، لیکن اِس آہ و بکا کا مطلب میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔ شاید خود اقبالؔ

نے آہ وزاری کا ذکر محض اس لیے کیا کہ سرِ دست اُسے تنہائی کا اس سے بہتر مصرف نظر نہ آیا تھا۔ یا شاید تنہائی کے خوف ناک تصور سے اُس کا آبائی خون سرد پڑ گیا تھا اور اُس کے ذہنِ رسا نے تنہائی سے آہ وزاری تک کے تمام مراحل کو ایک ہی جست میں طے کر لیا تھا۔ بہر حال کوئی بات تو ضرور ہو گی، جس کی پردہ داری مقصود تھی۔ البتہ غالبؔ کے ہاں ایک بیزاری کا احساس غالب ہے ـــــ "رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو"! وہ اپنے عزیز و اقارب، اپنے دوستوں، تیمار داروں اور خاص طور پر اپنے قرض خواہوں سے اس قدر بیزار ہے کہ اس کے لیے کُنجِ عافیت ہی در اصل نجات کی واحد صورت ہے۔ اس کُنجِ عافیت میں اگر آدھی بوتل شراب، دوستوں کے کچھ خطوط اور تھوڑا سا وظیفہ وقتاً فوقتاً ٹپکتا رہے تو جنّت کا اِس سے زیادہ حسین تصور اور کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ غالبؔ نے ہمیشہ اپنے گھر کو زنداں سمجھا اور بچوں کو بیڑیاں تصور کیا اور ان سے آزاد ہونے کا سُہانا خواب دیکھا۔ غالبؔ کے ہاں گوتمؔ نے کئی بار اپنی جھلک دکھائی، لیکن شاید یہ کوئی بزدل سا گوتمؔ تھا، جس نے غلط قدم اُٹھانے سے پہلے ہمیشہ سوچ بچار کی، جو ساری عُمر اپنے ہم زاد سے خوف زدہ رہا ـــــ جو اُسے ایک بار بھی "راہِ راست" پر نہ لا سکا!

لیکن یہ "راہِ راست" بھی تو ایک مفروضہ ہے۔ زندگی کی تو ساری

لکیریں ہی ٹیڑھی ہیں۔ اسی سے تنوّع اور رنگا رنگی پیدا ہوتی ہے۔ ورنہ سیدھی لکیر تو شاید سیدھی جہنّم کو جاتی ہے۔ اِنھی ٹیڑھی میڑھی لکیروں پر ہم آپ شب و روز گامزن ہیں اور شکر ہے کہ گامزن ہیں۔ حُجرے کے مولوی کی طرح کسی سیدھی لکیر کے رحم و کرم پر نہیں ہیں۔ میرا قصّہ سُنیے! جب کالج کی ہنگامہ خیزیوں اور "آوارہ گردیوں" سے میں اُکتا گیا تو میں نے ایک صُبح جنگل کا رُخ کیا اور کسی نہ کسی طرح اپنے اس آبائی گاؤں کو ڈھونڈ نکالا جو آبادی سے کوسوں دُور، ایک سوئی ہُوئی نہر کے کنارے چند اونگھتے ہُوئے درختوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ جب اُس سے میری پہلی ملاقات ہُوئی تو چھوئی مُوئی کی طرح یہ اور بھی سمٹ گیا۔ یہاں کی دُنیا ہی نرالی تھی۔ ہر طرف ایک گہرا سنّاٹا مسلط تھا۔ شام کو لحظہ بھر کے لیے درختوں کے جُھنڈ کی طرف جاتے ہُوئے کوّے آپس میں تبادلۂ خیالات کرتے تو شام گویا چمک اُٹھتی یا صُبح صُبح گاؤں کے مشرقی حصّے سے کمہار کا بُوڑھا گدھا اپنی بے سُری الاپ سے فضائے بسیط میں ارتعاش پیدا کر دیتا تو رُوح کے کنوّل کھل جاتے ورنہ اِس "کُنجِ عافیت" میں قبرستان کی سی چُپ کا احساس ہوتا، حتّٰی کہ گاؤں والے اپنی مثالی کم گوئی کے باعث محض سایوں کی طرح چلتے پھرتے نظر آتے، لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ جلد ہی سمٹا اور شرمایا ہُوا گاؤں نووارد سے مانوس

ہو گیا اور پر پرزے نکالنے لگا۔ اب ہر طرف گھما گھمی تھی، مانوسیت تھی اور رونق! بلکہ جلد ہی مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہاں تو مجھے "تنہائی" حاصل ہی نہیں تھی۔ سارا گاؤں ایک پھلتے پھولتے خاندان کی طرح تھا، جس کا ہر فرد دوسروں کے لیے ایک کھلی کتاب کا درجہ رکھتا تھا۔ عجیب زندگی تھی ـــــ سپاٹ، برہنہ، مربوط! یہاں راز، راز نہیں تھا۔ دل اور زبان کے درمیان پھولوں کی کوئی دیوار حائل نہیں تھی۔ مانوسیت اور مفاہمت کا یہ حال تھا کہ گاؤں کے کتے بھی مجھ سے باتیں کرتے تھے۔ دیکھتے ہی دُم ہلاتے یا ناچ ناچ کر میرے گرد چکر لگانے لگتے۔ پرندوں نے بھی مجھ سے ڈرنا چھوڑ دیا بھینسیں ایک عجیب بزرگانہ وقار کے ساتھ مجھے دیکھ کر گزرتیں اور گھوڑے مجھے دیکھتے ہی ہنہنانے لگتے۔ پھر رات کو چاند کا مانوس، مسکراتا ہوا چہرہ طلوع ہوتا جیسے پوچھ رہا ہو ـــــ "کہو، یار! کیا حال ہے؟" صبح سویرے سورج کسی بے نیاز برہم آنکھ کی طرح برآمد نہ ہوتا بلکہ ایک میٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے گدگداتا۔ ہر طرف مانوسیت، رفاقت، دوستی اور انجمن آرائی تھی ـــــ اور میں اس سے اکتا گیا، تھک گیا ـــــ اس سارے ماحول سے میرا دل اچاٹ ہو گیا اور گوتم بدھ کی طرح میں بھی کسی "گنج عزلت" کی آرزو میں پاگل سا رہنے لگا۔

لیکن اس کے بعد "گنج عزلت" کو پانے کے لیے میں نے جو قدم اٹھایا

شاید گوتم کے ذہن میں کبھی آ ہی نہیں سکتا تھا، یعنی جنگل کی راہ لینے کی بجائے میں نے ایک صبح اپنا بوریا بستر باندھا اور گاؤں کو الوداع کہہ کر اس کلبلاتے ہوئے بڑے شہر میں آگیا اور اب پچھلے کئی برس سے اس شہر میں مقیم ہوں۔ میری رہائش گاہ ساتویں منزل کا دو سو بیسواں کمرہ ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے ساتھ والے دو سو اکیسویں نمبر میں کون صاحب رہتے ہیں ان سے ملاقات کی ضرورت مجھے آج تک نہیں پڑی۔ انھیں بھی اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے کا کبھی خیال نہیں آیا۔ لفٹ کے ذریعے میں جب نیچے بازار میں اترتا ہوں تو ایک ڈولتا، امنڈتا ہوا جمِ غفیر مجھے بہا کر نجانے کہاں سے کہاں لے جاتا ہے اور پھر نجانے کیسے وہاں سے یہاں لے آتا ہے۔ یہاں کوئی مونس، کوئی دم ساز نہیں! بیمار پڑیئے تو تیماردار کوئی نہیں اور مر جائیے تو نوحہ خواں کرایہ پر بھی دستیاب نہ ہو گا۔ کاش، غالبؔ اِس بڑے شہر کی زیارت کر لیتا یا کاش، گوتم عرفانِ ذات کے لیے بڑ کے درخت کی بجائے میرے اِس کمرے کا رُخ کرتا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید آج دُنیا کی تاریخ مختلف ہوتی۔

دِیوار

میری یہ ایک نہایت بُری عادت ہے کہ پَو پھٹتے ہی اپنے بستر کو خیرباد کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ لیکن جس طرح ہر کانٹے کے ساتھ ایک پھول بھی چھپا ہوتا ہے۔ اسی طرح اس بُری عادت کے ساتھ ساتھ مجھے ایک اچھی عادت یہ بھی ہے کہ بستر چھوڑنے کے فوراً بعد اپنے مطالعے کے کمرے میں داخل ہو جاتا اور کُرسی پر نیم دراز ہو کر گھنٹوں اُونگھتا رہتا ہوں۔ اس اونگھ میں ایک عجیب سا لُطف ہوتا ہے۔ یہ دراصل بیداری اور خواب کے درمیان کی وہ NO MAN'S LAND ہے جہاں ہستی اور عدم سدا ایک دُوسرے سے ہم کنار ہوتے اور ہمیشہ جدا ہو جاتے ہیں۔ اس اُونگھ کے دوران میں آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو کر بھاری چلمنوں کی طرح گر تو جاتے ہیں، لیکن باہر کی روشنی کو روک نہیں سکتے۔ اعضاء پر ایک نیم خوابیدہ، شیریں سی

تھکاوٹ تو مسلط ہو جاتی ہے، لیکن ذرا سے کھٹکے پر وہ چونک کر بیدار ہو جاتے ہیں۔ ذہن، ایک عجیب سی رواں دواں اور نشیلی غنودگی میں ڈبکیاں تو لیتا ہے، لیکن سانس کے لیے گلہے گاہے اپنا سر پانی سے باہر ضرور نکالتا رہتا ہے۔ میرے نزدیک اُونگھنے کی یہ کیفیت زندگی کا متاعِ گراں بہا ہے اور اس کی تصدیق ہر سلجھا ہُوا افیونی اور ماڑی انڈس میں رات کو سفر کرنے والا ہر وہ مسافر کر سکتا ہے، جسے ہمراہی بستر میں اُٹھ کر بیٹھ جانے پر مجبور کر دیتے ہیں ــــ اُونگھنے کی اس شیریں کیفیت سے لطف اندوز ہونے کے لیے میں ہر صبح اپنے کمرے میں داخل ہو کر نیم دراز ہو جاتا ہوں لیکن ابھی مجھے اونگھتے ہُوئے چند لمحات ہی گزرتے ہیں کہ میری بیٹی مینا جغرافیہ کی کتاب ہاتھ میں لیے میرے کمرے میں آ دھمکتی ہے اور مجھ پر موسم، سطحِ مُرتفع اور حدودِ اربعہ کے سوالات کی بوچھار کر دیتی ہے۔ میں نے کئی بار اُسے سمجھایا ہے کہ اچھی بیٹیاں دن بھر میں سکول کا کام ختم کر لیتی ہیں اور صُبح سویرے اپنے آغا کو تنگ نہیں کرتیں۔ لیکن مینا بیٹی پرلے درجے کی ڈھیٹ واقع ہوئی ہے اور ہر روز سکول کا کام سکول جانے سے ذرا ہی پہلے نمٹانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کوشش کا سب سے بڑا "ہدف" مَیں ہُوں۔ چنانچہ حکم ہوتا ہے کہ دو تین منٹ میں مینا کو تین چار سوال ازبر کرا دُوں۔ اس خوشگوار اُمید کے ساتھ کہ سبق یاد کر لینے کے فوراً بعد وہ مجھے

اُونگھنے کے بےاکیلا چھوڑ کر چلی جائے گی ۔ میں اُسے جلد جلد سوالوں کے جواب بتانے لگتا ہُوں اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ اُسی وقت برآمد بھی ہو جاتا ہے، لیکن آج صُبح کے ایک سوال نے صورتِ حال بدل کر رکھ دی ہے۔اب میں اُونگھنے کی بجائے سوچنے کی طرف مائل ہو گیا ہُوں ۔ بینا کا پہلا سوال تو قابلِ ذکر نہیں ۔ اُس نے پُوچھا کہ مشرقی پاکستان کی آب و ہوا کیسی ہے ؟ اور میں نے نیم غنودگی کے عالم میں پہلے تو کہا کہ "اچھی ہے" اور پھر جب اپنی حماقت کا احساس ہُوا تو فوراً کہہ دیا "سرد خشک ہے"۔ وُہ "سرد خشک" کا تین بار ورد کرنے کے بعد دُوسرا سوال کرنے ہی والی تھی کہ مجھے دُوسری بار اپنی غلطی کا احساس ہُوا اور میں نے اپنی غفلت کو چھپانے کے لیے اپنی تصحیح یُوں کر دی کہ مشرقی پاکستان کی آب و ہوا ابھی کچھ دنوں سے سرد خشک ہے ورنہ پہلے تو گرم مرطوب ہُوا کرتی تھی ۔ بینا کی اس جواب سے تسلی ہو گئی اور میری جان میں جان آگئی ۔ بینا کا دُوسرا سوال تھا۔ "اچھا یہ بتائیے" کہ دیوارِ چین کس کو کہتے ہیں ؟" میرا تاریخ جغرافیے کا علم کچھ زیادہ قابلِ فخر نہیں ۔ اس لیے میں نے دیوارِ چین کا سلیس اردو زبان میں ترجمہ کرتے ہُوئے کہا "چین کی دیوار کو بولتے ہیں" اور چھٹی ہو گئی ، لیکن بینا بیٹی نے جب ضمنی سوال کیا کہ دیوارِ چین کیوں بنائی گئی ؟ تو میں نے جواب دینے کو تو دے دیا کہ حملہ آوروں کو اپنی طرف متوجہ

کرنے کے لیے چین کے کسی بادشاہ نے اسے تعمیر کیا ہوگا اور اس جواب سے اُس کی تشفّی بھی ہوگئی اور وہ چلی بھی گئی، لیکن اُس وقت کے بعد سے میری آنکھوں، ذہن اور اعضاء سے نیم غنودگی کی ساری کیفیت غائب ہوگئی ہے اور میں بیدار ذہن، کھُلی آنکھوں اور چاق و چوبند اعضاء کے ساتھ یہ سوچنے لگا ہوں کہ دیوار آخر کیوں بنائی گئی اور دیوار آخر کیوں بنائی جاتی ہے اور کیا انسان کی کہانی دیواروں کی تعمیر کے علاوہ بھی کچھ ہے؟

جہاں تک مجھے یاد ہے سب سے پہلی دیوار جنّت میں تعمیر ہوئی تھی۔ ممکن ہے آپ میری بات کی تائید میں کہیں کہ واقعی جنّت کو دوزخ سے جدا کرنے کے لیے خالقِ اکبر نے ایک دیوار کی ضرورت محسوس کی ہوگی اور فرشتوں نے اسے تعمیر بھی کر دیا ہوگا لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ کی نیک نیّتی کے باوصف مجھے آپ کی اس "تائید" سے اتفاق نہیں۔ جب خدا نے جنّت تخلیق کی، اُس وقت دوزخ کا تو نام و نشان تک موجود نہ تھا۔ دوزخ تو بہت بعد جنّت کے بطن سے پیدا ہوا اور پھر اسے جنّت سے علیحدہ کرنے کے لیے محض ایک بونڈری لائن کھینچ دی گئی۔ دیوار کی کہانی اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے لیے آپ ایک ایسی پُرسکون، شاداب، سرد یا گرم (اپنے مزاج کے مطابق) جگہ کا تصوّر کیجیے، جہاں آدم اور حوّا بدن کا لباس زیبِ تن کیے، ہونٹوں پر ابدی چُپ کی مُہر لگائے، مارے

مارے پھر رہے ہیں۔ وہ اپنے جہانِ نو کو حیرت و استعجاب سے دیکھنے میں اس قدر منہمک ہیں کہ انھیں ایک دوسرے کی موجودگی کا بھی علم نہیں۔ یا پھر یوں سوچیے کہ وہ ایک جان دو قالب ہیں اور ان میں دوئی اور تفریق گویا موجود ہی نہیں۔ پھر سمندر کے کنارے کسی کُبڑے سے درخت کا سہارا لیے اور سیب کا ایک ٹکڑا چباتے ہوئے آدم کی نظریں بے خیالی میں حوّا کی جانب اُٹھتی ہیں جو ایک نازک سی شاخ کی طرح اپنے ہی بار سے جھکی ہوئی سنگ ریزے اُٹھانے کی کوشش میں ہے اور آدم کا مُردہ دِل یکبارگی زور سے دھڑک اُٹھتا ہے۔ اُس کی پھیکی، بے جان آنکھوں میں روشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہونٹ لرزنے لگتے ہیں۔ سانس میں ناہمواری آجاتی ہے اور زبان پر ہزاروں لاکھوں التجائیں الفاظ کے رنگین لبادے زیبِ تن کیے تھرک اُٹھتی ہیں۔ اُدھر حوّا پہلی ہی نظر میں آدم کی اِس نگاہِ گرم کو بھانپ لیتی ہے اور اس کی آنکھیں محجوب سی ہو کر جھک جاتی ہیں۔ ہونٹوں پر تبسّم نمودار ہو جاتا ہے اور وہ شرما کر بڑی ادا کے ساتھ انجیر کے بڑے بڑے پتّوں سے اپنے جسم کو چھپا لیتی ہے —— یُوں پہلی دیوار معرضِ وجود میں آتی ہے دیوار، جو آدم اور حوّا کے درمیان مُسکراتی ہوئی آن کھڑی ہوتی ہے اور جسے پار کرنے کی دُھن میں آدم سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ میں اور آپ بخوبی جانتے ہیں۔ جنّت سے بے آبرو ہو کر

نکلنے کی داستان ہمیں آج بھی ازبر ہے!

جنّت کے اِس واقعے کے بعد آدم کی داستان دراصل بن باس کی داستان ہے۔ وہ جنّت سے نکلا تو جہانِ خاک کے مطلع پر ایک شہابِ ثاقب کی طرح دوڑتا چلا گیا اور پھر وہاں سے گرا تو خاک کی پہنائیوں میں سرگرداں نظر آنے لگا ــــــ کبھی یہاں، کبھی وہاں، ایک مسلسل اضطراب کی کیفیت میں اسیر، اپنی اُس فردوسِ گم گشتہ کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا، جو اب کہیں بھی موجود نہ تھی۔ پھر ایک صبح جب مسلسل سفر اور امٹ فاصلوں کے درمیان وہ لحظہ بھر کے لیے رُکا اور پہلی بار زمین کی سوندھی باس سے آشنا ہُوا تو بس زمین ہی کا ہو کر رہ گیا۔ اُس نے شاید بے دھیانی میں دو چار بیج زمین کے حوالے کر دیے ہوں گے۔ اب اُس نے دیکھا کہ فیّاض زمین نے ایک بیج کے عوض پورے ہزاروں بیج بنا کر اُسے لوٹا دیے۔ آدم حیران رہ گیا اور اُس کے پاؤں زمین کے اندر اور بھی دھنستے چلے گئے۔ اُسے زمین سے بے پناہ اُنس ہو گیا اور اُس نے ایک بچّے کی طرح زمین کو بڑے زور سے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیا۔ ساتھ ہی اُس کا دل کانپ اُٹھا کہ کہیں یہ زمین اُس سے چھن نہ جائے۔ چنانچہ اُس نے جھنجھلا کر زمین کو لاتعداد چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لیا اور ہر ٹکڑے کے گرداگرد ایک حصار سا کھینچ دیا ــــــ یہ دوسری دیوار تھی! دیوار جو اِس بار آدم اور حوّا کی بجائے آدم اور آدم

کے درمیان آن کھڑی ہوئی اور جیسے آدم نے جب پار کرنے کی کوشش کی تو اُس کی خوبصورت انگلیاں خونِ گرم سے آلودہ ہوگئیں۔ اس کے بعد کیا ہُوا؟ ——— اس کے بعد پہلی بار پلاؤ کھانے اور فاتحہ پڑھنے کی رسم قائم ہوئی، جو آج تک جاری ہے اور جس سے میں اور آپ بخوبی واقف ہیں۔

خُون کے اِس پہلے چھینٹے کے بعد کی ساری کہانی دیواروں کی مُسلسل تعمیر کی کہانی ہے۔ شروع شروع میں تو ایسی دیواریں تعمیر ہوئیں، جن پر تجریدی آرٹ کے نمونوں کا گماں ہوتا تھا۔ پھر دیکھتے دیکھتے یہ دیواریں سیدھی، بلند اور توانا ہوگئیں اور صدیوں تک "وقت" کے عفریت سے برسرِ پیکار رہیں لیکن وقت کی بے پناہ یلغار کے سامنے کوئی مادی دیوار کب ٹھہر سکی ہے؟ آج صُورتِ حال مُختلف ہے۔ آج سنگ و آہن کی دیواروں کے ساتھ ساتھ رنگ اور صَوت، لفظ اور معنی، خیال اور نظریے کی خُوبصُورت دیواریں زمین کا سینہ توڑ کر برآمد ہوگئی ہیں۔ دیواریں، جنھیں کوئی چیختا ہُوا طُوفان بھی مِسمار نہیں کرسکتا! مجھے یہ سب دیواریں پسند ہیں۔ یہ دیواریں میری آوارہ خرامی اور بے راہروی کے راستے میں سینہ تان کر کھڑی ہوگئی ہیں۔ اِن دیواروں نے میری ذات کی حدُود کو متعین کر دیا ہے۔ میری آواز کی بے مقصد پرواز کو روکا اور میرے جذبے کے اندھے طُوفان کے راستے میں بند باندھ دیا ہے۔ یہ انھی دیواروں کا کرشمہ ہے کہ میری رُوح کو جسم اور میرے خیال کو لفظ کا لبادہ عطا ہُوا

ہے۔ اگر یہ دیواریں نہ ہوتیں تو میں کبھی کا ہوا میں تحلیل ہو گیا ہوتا۔ سورج کی تمازت میں موم کے ٹکڑے کی طرح پگھل کر یا برف کے تودے کی طرح گھل کر زمین میں جذب ہو گیا ہوتا اور آج صفحۂ خاک میں میرا نشانِ پا تک باقی نہ ہوتا۔ بھلا کناروں اور دیواروں کے بغیر بھی کوئی باقی رہ سکتا ہے؟

طوطا پالنا

طوطا پالنا ایک اضطراری عمل ہے۔ زندگی کے بیشتر دوسرے اعمال منصوبہ بندی کے تابع ہیں، جیسے مثلاً بچے پیدا کرنا یا اگر خدا توفیق دے تو بچے پیدا نہ کرنا وغیرہ، لیکن طوطا پالنے کے لیے آپ کو کسی لائحۂ عمل یا سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ کسی درخت پر چڑھ کر طوطے کو پکڑنا اور ہمسائے کی روایتی طوطا کشی کے باوجود اس کا آبائی پنجرہ اپنی تحویل میں لینا بھی دراصل ایک قطعاً غیر شعوری عمل ہے، جسے آپ کسی اندرونی دباؤ کے تحت سرانجام دیتے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ایک سہانی صبح اچانک آپ کے دل میں طوطے کے لیے محبت پھڑپھڑانے لگتی ہے اور پھر دنیا جہان آپ کی نظروں میں اندھیر ہو جاتا ہے۔ لکھنا پڑھنا، سونا جاگنا حتیٰ کہ گانا اور نہانا بھی آپ سے چھوٹ جاتا ہے اور طوطے کی موہنی صورت ہر دم آپ کی نظروں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔

سُرخ چونچ آپ کے حواس پر مسلط ہو جاتی ہے۔ سبز پر آپ کی ساری کائنات کا احاطہ کر لیتے ہیں اور ایک میٹھی رسیلی آواز دبے پاؤں بڑھ کر آپ کی ذات پر یُوں چھا جاتی ہے کہ اس کے سوا کوئی اور آواز آپ کو سُنائی ہی نہیں دیتی۔ عشق کا یہ سیلاب بلا آپ کے حواس کو قطعاً معطّل کر دیتا ہے اور آپ کسی انجانے جذبے کے تحت طوطے کی تلاش میں مارے مارے پھرنے لگتے ہیں، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ آپ ایک طلسمی خوابناک سی دُنیا میں بہہ نکلتے ہیں۔ جس میں طوطوں کی ڈاروں اور منقّش پنجروں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ پھر جب آپ اس خواب سے بیدار ہوتے ہیں تو آپ کو اپنی کھاٹ کے قریب ایک پنجرہ اور پنجرے میں میاں مٹھّو بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، کیونکہ اس خواب سے بیدار ہونے پر آپ کو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ عُمرِ عزیز کا ایک دور آناً فاناً ختم ہو گیا اور ایک بالکل نئے دور نے دُھندلکوں سے طلوع ہو کر آپ کا ہات بڑی آہستگی سے اپنے ہاتوں میں تھام لیا۔ طوطا دراصل ایک نئے دور کا نقیب ہے۔ وہ عورت کی طرح آپ کی زندگی میں صرف اُس سمے داخل ہوتا ہے جب آپ ایک نئی ذہنی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ بلکہ شاید یوں کہنا بہتر ہو گا کہ طوطا اس نئی ذہنی کیفیت کا ایک اہم سمبل ہے۔ حیرت ہے کہ جدید اردو شعرا نے کالے کوّے سے لے کر کالے کبوتر تک کا فاصلہ تو طے کر لیا، لیکن سبز

طوطے کی علامت اُن کے کلام میں اُبھر نہ سکی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہمارے اکثر جدید شعرا بھی ذہنی طور پر کوّے اور کبوتر کے مدارج سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ جس روز وُہ طوطے کے مقامِ بلند پر جا پہنچے۔ اِس بات کو طے سمجھیے کہ ہماری شاعری اور قوم ——— دونوں کا بیڑا پار ہو جائے گا۔

کسی مسئلے کو سمجھنے کے لیے اسے ادوار اور مدارج میں تقسیم کرنے کی بدعت بہت پرانی ہے۔ مفکّرین نے خاص طور پر اس "مصیبت" کو اپنایا اور زندگی کے مدّ و جزر کو اکثر ٹکڑوں میں بانٹ کر دِکھایا ہے۔ میں ہر زمانہ تقسیم کے اس عمل کو اپنا مزاج بلکہ اپنی خوشبو ضرور عطا کرتا ہے۔ اگلے وقتوں میں زندگی بالکل سپاٹ اور سیدھی سادی سی تھی۔ لوگ بھی ذہنی طور پر بالکل کورے ہوں گے۔ چنانچہ آپ دیکھیے کہ وہ نہ صرف روشنی کو روشنی اور تاریکی کو تاریکی کا نام دینے کی احمقانہ حرکت کے مرتکب ہوتے تھے بلکہ زندگی کو بھی بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے غیر دلچسپ خانوں میں بانٹ دِیا کرتے تھے۔ اس سے زندگی میں وہ رنگا رنگی اور تنوّع کیسے پیدا ہو سکتا تھا جو آج ہمیں حاصل ہے۔ آج ہم چیزوں کی زبان میں نہیں بلکہ علامتوں کی زبان میں سوچتے ہیں اور یہی ہمارا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ چنانچہ اب اگر مجھے کبھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح سوچ بچار

کی فرصت ملتی ہے تو میں زندگی کی تقسیم سیدھے سادے اور سپاٹ انداز میں نہیں کرتا بلکہ اسے علامتوں کی زبان میں پیش کرتا ہوں۔ اِس سے مجھے جو لاتعداد فوائد حاصل ہوئے ہیں اُن کی داستان کسی اور وقت پر اُٹھا رکھتا ہوں۔ فی الحال یہ دیکھیے کہ میں نے زندگی کو تین اہم ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا وہ دور جس میں آپ کبوتر پالتے (بلکہ اُڑاتے) ہیں۔ دُوسرا وہ دور جس میں آپ مُرغ پالتے (بلکہ لڑاتے) ہیں۔ تیسرا وہ دور جس میں آپ طوطا پالتے اور گھنٹوں بڑبڑاتے ہیں۔ اُڑانے، لڑانے اور بڑبڑانے کے انہی تین مدارج سے یہ زندگی عبارت ہے۔

اِن میں سے کبوتر پالنے کا رُجحان عہدِ طفلی سے خاص ہے۔ آپ مکان کی چھت پر ایک لمبا سا بانس ہات میں لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور گھنٹوں کبوتر کو ہوا میں قلابازیاں لگاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ہر بار جب کبوتر فرطِ محبت سے آپ کی طرف لوٹتا ہے تو آپ بانس کو ایسے تہدیدی انداز میں بلند کرتے ہیں کہ وہ بے چارہ پھر سے آسمان کی طرف اُڑنے اور قلابازیاں لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کبوتر کی اِس بے بسی کو دیکھ کر آپ کا دل خوشی سے دھڑک اُٹھتا ہے اور اس کے اندر بھی قلابازیاں لگانے کی آرزو کروٹیں لینے لگتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عہدِ طفلی ختم ہوتے ہی آپ کبوتر کی دُنیا سے باہر نکل آئیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ساری عمر بانس ہات

ہیں لیے چھت پر گزار دیں۔ ہاں کبھی کبھی اِس جذبے کی تہذیب بھی ہو جاتی ہے اور آپ کبوتر کو اپنے کلچر کا واحد مظہر اور اپنی شاعری کا منفرد سمبل قرار دینے کے لیے چھت سے نیچے بھی اُتر آتے ہیں لیکن بانس آپ کے ہات میں پھر بھی موجود رہتا ہے۔ اِس سے مفر نہیں!

زندگی کا اگلا دَور مُرغ پالنے اور لڑنے لڑانے کا دَور ہے۔ مُرغ کی زندگی انسان کے گرِہست آشرم سے شدید مماثلت رکھتی ہے۔ وُہی گھر، بیگمات، اَن گنت بچّے اور ایک نقطے پر رُک کر اپنی مملکتِ خداداد پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالنے کی روِش! اِس دَور میں آپ مجسّم "انا" کے رُوپ میں ساری دُنیا سے متصادم ہوتے اور اپنی ذات کے تحفّظ کے لیے جان کی بازی تک لگا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ آپ کی حالت اُس مکڑی کی سی ہوتی ہے جو جالے کے مرکز میں بیٹھی دُور دیس سے آنے والے کا انتظار کرتی ہے اور جس کے قدموں سے اُس کی ذات کے دھاگے نکل کر کائنات کی وُسعتوں میں پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ یہ دور فتحمندی اور وجاہت کا دور ہے اور اگر اِس میں آپ سینہ پُھلا کر اور گردن ٹیڑھی کر کے نظامِ عالم پر ایک چھچلتی ہُوئی سی نظر ڈالتے ہیں تو آپ اِس میں بالکل حق بجانب ہیں۔ یہ آپ کا عہدِ حکومت ہے۔ اِس ایک لمحے کو وجود میں لانے کی خاطر ہی تو یہ کائنات تخلیق ہُوئی تھی اور آپ کو محسُوس ہوتا ہے گویا آپ اِس لمحے پر اپنا قدم رکھے کائنات

کے مرکزی نقطے پر کھڑے ہیں اور زندگی رادھا کی صورت آپ کے گرد ناچتی چلی جا رہی ہے۔

لیکن کب تک؟ آخر ایک دن ایسا بھی طلوع ہوتا ہے کہ یہ سارا طلسم آنِ واحد میں پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ کہیں سے سرد ہوا کا پاگل جھونکا کھڑکی کا پٹ کھول کر بیبا کانہ اندر گھس آتا ہے اور آپ یکایک خود کو سکڑتا ہوا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ چند لمحے ——— اور مکڑی اپنے جالے کو نگل جاتی ہے۔ کائنات اندھیرے میں ڈوبنے لگتی ہے اور چراغ آخری سسکی کے لیے تیار ہو جاتا ہے، لیکن یہ سب کچھ شہنائیوں اور تاشوں کی آواز میں رُونما نہیں ہوتا بلکہ ایک انوکھے "سمبل" کا ہات تھامے منظرِ عام پر آتا ہے۔ یکایک ایک صبح آپ کی کھاٹ کے پاس سے طوطے کا کرخت اور خوفناک قہقہہ بلند ہوتا ہے اور آپ آنکھیں مل کر دیکھتے ہیں کہ اپنے پرائے، دوست دشمن، بیوی بچے ——— سب آپ کی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور گونگی، بہری کائنات میں آپ اور آپ کا ہم زاد ——— میاں مٹھو، باقی رہ گئے ہیں اُس وقت آپ کو محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کی رُوح طوطے میں منتقل ہو کر آپ کے سامنے آ گئی ہے۔ یہیں سے خود کلامی کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

آپ قطعاً غیر شعوری طور پر کہیں سے کچے پھل، اور روٹی کے چند ٹکڑے حاصل کرتے ہیں اور طوطے سے گفتگو کا وہ سلسلہ شروع کر دیتے ہیں جو آپ کے

آخری دم تک قائم رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ طوطے سے اِنسان کو ہرگز مفر نہیں اور طوطا ہر شخص کی زندگی میں زُود یا بدیر ضرور نمُودار ہوتا ہے۔ پُرانے زمانے میں دیو کی جان طوطے میں مقیّد ہوتی تھی۔ اِدھر کسی نے طوطے کی گردن مروڑی، اُدھر دیو صاحب اِس جہانِ فانی سے کُوچ فرما گئے لیکن میرا خیال ہے کہ دیو کی جان ازل ہی سے طوطے کے تنِ نازک میں مقیّد تو نہ ہوگی، دیو کو یہ حادثہ صرف اُس وقت پیش آیا ہوگا جب اُس کے قوای مضمحل ہو گئے ہوں گے اور عناصر میں اعتدال باقی نہ رہا ہوگا۔ دراصل زندگی کے سفر میں ایک خاص سنگِ میل کے بعد طوطے کا یکایک نمُودار ہونا مشیّتِ ایزدی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ ایک ایسا مرحلہ ہے جو دُوسرے مراحل کے بعد لازمی طور پر آپ کے سامنے آتا ہے۔ آپ اِس مرحلے سے کیسے بچ سکتے ہیں؟

کل میں ایک طویل سفر کے بعد واپس آیا تو ننھّا سلیم لپک کر میری ٹانگوں سے چمٹ گیا اور اپنی توتلی زبان اور پھُولے ہُوئے سانس کے ساتھ مجھے بتانے لگا کہ دادی امّاں نے طوطا رکھ لیا ہے۔ یکایک میری ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں اور دل بُجھ سا گیا۔ میں سر جھکائے گھر میں داخل ہُوا تو آنگن میں کھاٹ کے قریب پنجرہ رکھّا تھا اور میاں مٹھّو بڑے فخر سے گردن ٹیڑھی کیے اپنی تازہ فتوحات کا جائزہ لے رہے تھے اور پنجرے کے بالکل قریب

میری والدہ گُم سُم بیٹھی، طوطے کے طلسم میں قید، ہولے ہولے بُڑبُڑا رہی تھیں۔ طوطے کے آتے ہی اُن کی زندگی میں بُڑبُڑاہٹ اور خُود کلامی کا دَور شرُوع ہو گیا تھا۔ یکایک میری نظروں کے سامنے اُس سُرخ آنکھوں والے طوطے کے نقوش اُبھر آئے جو آج سے پندرہ برس قبل میرے نانا جان مرحُوم نے پالا تھا اور جس سے وُہ اپنی زندگی کے آخری ایّام میں دن رات باتیں کرتے رہتے تھے۔

طوطے نے شاید میرے دل کی بات بُوجھ لی۔ بڑے فخر سے گردن موڑ کر مجھے للکارا ــــــ "آئیے! آئیے!"

"شٹ اَپ" مَیں چیخا اور دوڑ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

میری چالیسویں سالگرہ

کل میری چالیسویں سالگرہ تھی۔ کرکٹ کے اُس کھلاڑی کی طرح، جس نے امپائر سے ساز باز کر کے کسی نہ کسی طرح چالیس رنز بنا لیے ہوں اور اب اپنی سبز ٹوپی سر سے اُٹھا اُٹھا کر خلقِ خدا سے داد وصول کر رہا ہو، میں نے بھی بڑے فخر سے اپنے احباب کو خط، ٹیلیفون اور اشارے کنائے سے اپنے اس عظیم کارنامے کی خبر پہنچا دی اور پھر دن بھر اُس "داد" کو وصول کرتا رہا جو ٹیلیفون کی تاروں، کمرے کے دروازوں، خط کی لکیروں، استہزائیہ قہقہوں اور نصیحت آمیز جملوں کے ذریعے مجھ پر نازل ہوتی رہی۔ میری چالیسویں سالگرہ کی رُوح فرسا خبر نے میرے احباب کو گویا جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا اور اُنھوں نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں "اچھا تو تم بھی متحرک تھے۔ تمھارے انداز سے تو معلوم نہ ہوتا تھا" ——— حضرت شیخ

جو کم از کم تین بار "اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکُشی" کی کوشش کر چکے ہیں اور پھر بھی شاخِ نازک پر بنے ہُوئے آشیانے کو ناپائدار ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے، اس خبر کو سنتے ہی آگ بگولہ ہو گئے اور ایک آندھی کی طرح چنگھاڑتے ہُوئے میرے کمرے میں آ دھمکے۔ کہنے لگے ——

"یعنی شرم نہیں آتے تمھیں! آخر اس میں فخر کی بات ہی کیا ہے! سمجھاؤ نا! چالیس سال، یعنی چار سو اور اسّی مہینے، ساڑھے چودہ ہزار دن، تین لاکھ پینتالیس ہزار گھنٹے! دو کروڑ سات لاکھ منٹ! اتنا عرصہ زندہ رہنے کے بعد کیا ابھی تمھیں مزید زندہ رہنے کی حسرت ہے؟" —— اور میں کہ اپنی چالیسویں سالگرہ پر ابھی خود کو بالکل تازہ اور زندہ محسوس کر رہا تھا، مجھے یکایک اس بات کا احساس ہُوا کہ تقدیر نے دھکّا دے کر مجھے شانگری لا سے باہر نکال دیا ہے، جیسے میرا جسم مٹھی بھر ہڈیوں میں بدل گیا ہے اور اس پر وقت کی لاتعداد جھرّیاں نمودار ہو گئی ہیں۔

لیکن یہ کیفیت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ حضرتِ ش رخصت ہُوئے ہی تھے کہ میرے عزیز ترین دوست اور بزرگ جنابِ ص —— نے ٹیلیفون پر مجھے مُبارکباد دی۔ کہا —— "عزیزِ من! چالیسویں سالگرہ مُبارک ہو! اب گویا تم نے ذہنی پختگی کے دَور میں اپنا پہلا قدم رکھّا!"

—— ریسیور میں نے رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ چار کتابیں، دو بچے، ایک

مکان اور لاتعداد دوست پیدا کرنے کے بعد بھی اگر میں اب تک محض ذہنی ناپختگی کے دور میں تھا تو آنے والے ذہنی پختگی کے ایّام میں کیا ہوگا؟ اِس کا تصوّر کرتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور مَیں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا لیکن دُوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں نے تو ابھی زندگی میں پُوری طرح قدم ہی نہیں رکھّا (بقول حضرتِ صَ) اس لیے شؔ کی بات تو بالکُل غلط ہُوئی نا! یکایک جیسے میں تقدیر کو دھکّا دے کر شانگری لا میں دوبارہ داخل ہو گیا۔ جھُرّیاں مِٹ گئیں۔ ہڈیاں گوشت کی تہوں کو گھونگھٹ بنا کر چھُپ گئیں اور زندگی میرے ہر بُنِ مُو سے پسینہ بن کر چھلکنے لگی۔ مَیں نے سوچا یہ بھی اچّھا ہُوا کہ اس ٹیلیفون کال سے پہلے ہی حضرتِ شؔ رخصت ہو چکے تھے ورنہ آج میرے ہاتھوں میں اتنی سکت ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ مَیں ان کے نازک آشیانے کو ناپائدار ثابت کر سکتا تھا۔

کل میری چالیسویں سالگرہ تھی اور اگرچہ ابھی میرے اور اس سالگرہ کے درمیان محض ایک کالی کلوٹی رات حائل ہُوئی ہے تاہم مجھے ابھی سے یہ محسُوس ہو رہا ہے کہ میں نے تو آنِ واحد میں ایک بہت بڑی اور گہری خندق کو عبُور کر لیا ہے۔ چُنانچہ سالگرہ کے دِن کی ساری باتیں اب محض ایک خوابِ پریشاں کی باتیں نظر آ رہی ہیں لیکن کل یہ بات کب تھی؟ کل دوستوں کے طعنوں، نصیحتوں

اور جھمیلوں کے باوصف مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے میں اپنی عمر کے ایک بہت بڑے دَور سے منقطع ہو گیا ہُوں اور عمر کے دُوسرے بڑے دَور میں ابھی مَیں نے قدم ہی نہیں رکھا اور میری حالت اُس شخص کی سی ہے جو دو سرحدوں کے درمیان کسی NO MAN'S LAND. میں لحظہ بھر کے لیے رُک گیا ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کل مجھے خود پر منزل سے بے گانہ کسی بے پتوار کشتی کا گمان نہیں ہُوا تھا بلکہ یہی احساس قوی رہا کہ میں زندگی کے ایک دَور سے نکل آیا ہُوں لیکن اس کے ساتھ میری ذات کی ڈور ابھی تک بندھی ہے اور مَیں دُوسرے دَور میں ابھی داخل تو نہیں ہُوا لیکن کنارِ ساحل کی طرف آنے والے جہاز کی طرح میری ذات کا لنگر پہلے ہی سے اس کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے —— بس، یُوں سمجھیے کہ چالیسویں سالگرہ کا دِن ایک پُل کی مانند تھا —— پُل، جو ماضی اور مستقبل کے درمیان ہَوا میں معلق کھڑا تھا، لیکن جس کا ایک پاؤں ایک مُلک اور دُوسرا دُوسرے مُلک کی سرزمین میں پُوری طرح پیوست تھا۔

مَیں دِن بھر اِس لرزتے اور ڈولتے ہُوئے پُل پر یکہ و تنہا کھڑا رہا۔ اور احباب کی اُن آوازوں کو سُنتا رہا جو دریا کے دونوں کناروں سے پے درپے آرہی تھیں۔ جن احباب کی محفل کو مَیں نے خیرباد کہا تھا، وہ مجھ پر طعنوں اور کوسنوں کی بوچھار کر رہے تھے۔ جن احباب کی محفل میں

مجھے داخل ہونا تھا، وہ مجھے نئی سرزمین کے ہزار خوبصورت پہلو دکھانے میں ہمہ تن مصروف تھے۔ اور میں خود آوازوں کی اس پرکھ سے بے نیاز، ڈولتے اور لرزتے ہوئے پُل پر لحظہ بھر کے لیے گویا رُک گیا تھا۔ اُس وقت مجھے اوائل عُمر کا وہ واقعہ بار بار یاد آیا جب میں چند روز کے لیے اپنے آبائی گاؤں میں دماغ کو سکون دینے کے لیے گیا تھا۔ درختوں کی ہریالی میں ڈُوبے ہُوئے اس گاؤں سے مَس ہو کر ایک الھڑ سی تیز رفتار ندی بہتی تھی اور دیہاتیوں نے اس ندی کو پار کرنے کے لیے اس پر ایک مریل سی شیشم کی لکڑی رکھ دی تھی۔ یہ گویا کسی دیہاتی انجنیئر کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا اور اس گاؤں کو دُوسرے دیہات سے ملانے کا واحد ذریعہ تھا۔ اس سے تردامنی کا عمل تو رُک نہ سکا تھا کیونکہ اِس پُل صراط کے عین درمیان پہنچ کر لحظہ بھر کے لیے سر چکراتا تھا، پاؤں ڈولتے تھے اور دُوسرے ہی لمحے ندی پار کرنے والا ندی کی گہرائی، پانی کی رفتار اور سمت کا جائزہ لینے اور زندگی کو موت کے چنگل سے بچانے کے لیے ہات پاؤں مارتا نظر آتا تھا۔ تاہم کم از کم دس فی صد لوگ ایسے ضرور تھے جو پُل پر سے بخیر و خوبی گزر جاتے تھے اور یہ بات پُل کی کامیابی کا ایک بہت بڑا ثبوت تھا۔ چونکہ میں گاؤں میں اجنبی اور نووارد تھا اور دُوسرے دیہات سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا اس لیے پُل کو عبور کرنے کا مسئلہ مجھے درپیش نہ تھا۔ تاہم میں اکثر اس پُل کے درمیان تک پہنچ کر اس پر

بیٹھ جاتا اور اپنی ٹانگیں لٹکا دیتا۔ پھر میں پانی پر نظریں جما دیتا۔ ایک لحظہ کے لیے مجھے پانی چلتا ہُوا نظر آتا، لیکن دُوسرے ہی لمحے مجھے محسوس ہوتا کہ پانی تو بالکل ساکن ہے البتہ لکڑی کا پُل اور اس پُل پر بیٹھا ہُوا یہ ناچیز برق رفتاری سے پیچھے کی طرف اُڑا چلا جا رہا ہے۔ پھر میں اچانک پانی سے اپنی نظریں جُدا کر کے ندّی پر جھکے ہُوئے کسی درخت کی شاخوں میں انھیں اُلجھا دیتا اور یکایک پُل کو جیسے بریک سی لگ جاتی۔ پُل رُک جاتا اور ندّی پہلے کی طرح بہنے لگتی۔ لکڑی کے پُل کا یہ عجیب و غریب تجربہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں ضرور دبکا پڑا ہوگا۔ کیونکہ کل جب میں نے چالیسویں سال میں قدم رکھا تو مجھے محسوس ہُوا، گویا میں ایک بار پھر اُس لکڑی کے پُل پر آ کر بیٹھ گیا ہُوں اور اگرچہ وقت کی ندّی پہلی سی تیز رفتاری کے ساتھ رواں ہے تاہم میں نے نظر کے ذرا سے پھیر کی مدد سے اسے روک لیا ہے اور اس سے منقطع ہو کر چالیسویں برس کے اُڑن کھٹولے میں بیٹھا اُڑا چلا جا رہا ہُوں۔

میں شام تک اس لکڑی کے پُل پر بیٹھا رہا —— پُل جو میرے ماضی اور مستقبل کے درمیان حال کا ایک لرزتا، کانپتا، ڈولتا ہُوا لمحہ تھا۔ شام کے قریب میں اس پُل پر سے اُٹھا، لڑکھڑایا، سنبھلا اور تماشائیوں کے قہقہوں، ہمّت افزا جملوں اور شاباش شاباش کے نعروں میں "پُل" کے اس لمحے کو

روند کر آگے بڑھ گیا۔ یکایک پُل غائب ہو گیا۔ ندی پھیل کر ایک بحرِ ذخار کی صورت اختیار کر گئی اور اس کے دُوسرے کنارے سے آنے والی آوازیں کنوئیں کی تہہ سے اُبھرنے والی آوازوں میں تبدیل ہو گئیں۔ پھر یہ آوازیں بھی تھم گئیں۔ احباب نے ایک کرب انگیز خاموشی میں چائے اور اس کے لوازم پر ہاتھ صاف کیا۔ حسبِ توفیق چند بکھری ہُوئی سرگوشیوں میں مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا اور دروازے سے نکل کر باہر کی لامحدود تاریکی میں گم ہوتے چلے گئے۔

اور پھر سالگرہ کا دن ختم ہو گیا اور رات ہی رات میں اس پر صدیوں کی برف جم گئی۔ آج صورتِ حال یکسر مختلف ہے۔ آج میں نے ایک نئی مملکتِ خداداد میں اپنا پہلا قدم رکھا ہے اور قدم رکھتے ہی مجھے محسوس ہُوا ہے کہ اس سرزمین کے بارے میں میرے ہمجولیوں کے خیالات کسی قدر ناپختہ اور غلط تھے (جنابِ ص متوجّہ ہوں)۔ شاید ہم نے زندگی کے اس دور کو بچپن کی آنکھ سے دیکھا تھا اور اس لیے ہمیں اس کی ہر شے فرسودہ، بُوڑھی اور "کائی زدہ" نظر آئی تھی، لیکن اب کہ مَیں نے ذرا قریب سے اس پر ایک نگاہ ڈالی ہے تو اس کی جُھرّیوں اور سلوٹوں میں مجھے عرفان و انکشاف کے کئی پہلو اُبھرے ہُوئے نظر آئے ہیں اور مجھے محسوس ہوا ہے گویا زندگی کی ہر شے پہلی بار اتھاہ تاریکیوں سے طلوع ہو رہی ہے۔ آخر صحرا بھی تو دُور

سے ایک خوفناک، خشک اور بے رنگ و بُو سی چیز نظر آتا ہے لیکن آپ اس میں داخل ہوں تو کچھ عرصے کے بعد اس کے ہزار نکیلے پہلو آپ کے دامن کو قدم قدم پر اپنی طرف کھینچنے لگیں گے۔ پھر صحرا کی لامحدود وسعت نظر کی کشادگی کی ضامن بھی تو ہے۔ یہاں کوئی سرسبز پہاڑی کوئی دُھلا دُھلایا درخت، کوئی نرم و نازک چہرہ آپ کی نظر کو روکنے کے لیے نمودار نہیں ہوتا۔ یہاں سے وہ سفر شروع ہوتا ہے جس میں آپ کے ہمراہ آپ کے ہم زاد کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ جو احباب ہمراہی کا وعدہ کرتے ہیں، وہ آپ کو صحرا میں سبز باغ دکھاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں جھانک کر دیکھیے! یہ خود بھی اکیلے ہیں!!

واپسی

کل میں نے اپنے دوست ــــ ع کے سامنے ایک بجھارت رکھ کر اُسے بُری طرح اُلجھا دیا۔ بجھارت یہ تھی کہ فرض کرو، کوئی شخص اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں پیادہ پا روانہ ہے (سائیکل پر بھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں) اچانک وہ حیرت سے دیکھتا ہے کہ اُس کے سامنے ایک دریا نمودار ہو گیا ہے جو پُل سے قطعاً بے نیاز ہے۔ اسے عبور کرنے کے لیے کوئی ناؤ یا ملّاح تک موجود نہیں۔ حتّیٰ کہ وہ روایتی عاشق مزاج گھڑا بھی غائب ہے جس کا ذکر اب صرف ریڈیو پر ہی سننے میں آتا ہے۔ دریا کا پاٹ کشادہ اور اس کی گہرائی بہت زیادہ ہے اور مسافر آئینِ شناوری میں بالکل کورا ہے ایسی صورت میں وہ کیا کرے گا؟ ــــ یہاں میں نے اپنے سوال کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے قدرے توقّف کیا اور جب میں نے

دیکھا کہ ــــــ ع کا سر کوئلوں کی انگیٹھی کی سطح تک جھک آیا ہے اور اُس کا ازلی وابدی رفیق یعنی سگریٹ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کسی جلتے ہوئے کوئلے کی چٹان پر ہولے ہولے سُلگنے لگا ہے تو میں نے معًا اپنے سوال پر ایک اور سِل رکھتے ہوئے پُوچھا ــــــ "اچھا، تو ایسی صُورت میں تم "کیا کرو گے ؟" میرا خیال تھا کہ اب میرے دوست کا سر کچھ اور جھک کر انگیٹھی سے جا ٹکرائے گا، اُس کے سگریٹ کی ادھ جلی ارتھی دفعتہً بھڑک اُٹھے گی اور وہ بڑے عجز سے اپنی شکست تسلیم کرلے گا، لیکن معلُوم ہوتا ہے کہ میں نے انسانی مُدافعت کے سارے امکانات کا جائزہ لیے بغیر ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا (اپنی ناتجربہ کاری کا مجھے اعتراف ہے)، کیونکہ ع کے سامنے جب یہ نازک مرحلہ نمُودار ہُوا تو اچانک اُس کے سارے خُوبصُورت دانت کھٹ سے نمُودار ہو گئے اور اُس نے قومی کردار کے تمام تر پہلوؤں کو اپنی ذات میں مجتمع کر کے اور اپنے بدن کی کمان کو ایک زہر آلود بان میں تبدیل کرتے ہوئے تُنک کر کہا ــــــ "جنابِ والا! آپ کا کیا خیال ہے کہ میں وہاں دریا کنارے کسی جھونپڑی میں سمادھی لگا کر بیٹھ جاؤں گا۔ ہرگز نہیں! اگر دریا نے مجھے راستہ نہ دیا تو میں ــــــ تو مَیں ــــــ فوراً واپس آجاؤں گا۔"

اب میری باری تھی کہ میرے جُملہ دانت کھٹ سے نمودار ہو جاتے اور

"میرا سر جھک کر انگیٹھی کی سطح سے جا ٹکراتا۔" ع شاہد ہے کہ اس کی زبان سے یہ تاریخی جملہ سُن کر میری حالت غیر ہو گئی تھی اور میں تادیر کچھ ایسی حرکتیں کرتا رہا تھا جو ٹھنڈے پانی میں گرے ہُوئے ناتجربہ کار غوطہ خور کی قسمت میں ازل سے مرقوم ہیں۔

لیکن اِس سانحے کو گزرے اب پُورے چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اب مجھے ع کے ردِّ عمل میں بُزدلی یا عافیّت کوشی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا بلکہ مجھے تو محسُوس ہوتا ہے جیسے اُس نے واپسی کی خواہش کا اِظہار کر کے خود میرے دل کی بات کہہ دی ہو۔ بہر کیف اب میرے سوچنے کا انداز کچھ یُوں ہے کہ واپسی کے عمل میں بُزدلی کا عنصر ہرگز شامل نہیں۔ بے شک بُزدلی کی مروّجہ تعریف یہ ہے کہ اِنسان دُشمن کے دباؤ کے تحت اپنے نقوشِ قدم پر واپس ہٹتا آئے، لیکن میں ایسی کسی "واپسی" کا ذکر نہیں کر رہا، کیونکہ یہ عمل واپسی کے آئین کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے دو بیل ماتھے سے ماتھا اور سینگ سے سینگ جوڑے ایک دُوسرے کو مخالف سمتوں میں دھکیل رہے ہوں اور اُن میں سے جو بیل زیادہ قوی الجثّہ، طاقتور اور خونخوار ہو، وہ دُوسرے نسبتاً شریف اور مہذب بیل کو دھکیلتے دھکیلتے کسی کھڈ کے کنارے تک لے جائے اور پھر ایک ہی ٹکر سے اُسے کھڈ میں گرا دے۔ اِس قسم کی واپسی آئین

شنہ زوری کی زبان میں بزدلی، کم ہمتی اور شکست کے الفاظ ہی سے موسوم ہو گی۔ میں جس واپسی کی تعریف میں رطب اللسان ہوں، وہ یہ ہے کہ جب حریف زیادہ طاقتور ہو اور کامیابی کا امکان باقی نہ رہے تو رات کے اندھیرے میں دشمن کی آنکھوں میں راکھ جھونک کر اس کے نرغے سے نکل آئیے اور اُوپر سے ایک بڑا سا چکّر لگا کر دوبارہ اُس مقام پر تشریف لے آئیے جہاں سے آپ نے اپنی مُہم کا آغاز کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اِس مقام پر تمام لوازم پہلے سے موجود ہوں گے۔ کوئی خوش ذائقہ سا مشروب پیجیے، کیک کا کوئی لذیذ سا ٹکڑا منہ میں ڈالیے، چائے کے بڑے بڑے گھونٹوں سے مشامِ جان کو تازہ کیجیے اور اپنا مزے سے بیٹھ کر شیخ چلی مرحوم کی وصیّت پر عمل کیجیے۔ واپسی کا یہ اقدام ایک ضروری اور مثبت عمل ہے اور تمام بڑے بڑے شاعروں، فلاسفروں اور جاسوسی ناول لکھنے والوں نے اِس سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھایا ہے۔

اِس بات کے ثبوت میں سب سے پہلے مشہور نظم "ہمالہ" کو یاد کیجیے، جس میں شاعر نے اُس زمانے کا ذکر کرتے ہُوئے جب ہمالہ کا دامن مسکنِ آبائے انساں بنا تھا، اِس خواہش کا اظہار کھُلے بندوں کیا ہے کہ اے تصوّر! تُو مجھے پھر وُہی صُبح و شام دکھا اور اے گردشِ ایام! تُو مجھے اپنے اُڑن کھٹولے میں بٹھا کر پیچھے کی طرف دیوانہ وار دوڑتی جا! ___ اِس

قسم کی واپسی پر آپ یا مجھ کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ یُوں بھی شاعر تو شاذ ہی اپنے بچپن کی فضا سے باہر آتا ہے۔ پھُول کی پتّی کو انگلیوں میں مسل کر یا تتلی کے پیچھے بے تحاشہ بھاگنے میں اسے جو لُطف آتا تھا وہ آج بھی اُسی کے رحم و کرم پر ہے اور ہر اُس موقع کی تلاش میں رہتا ہے جب اُسے دوبارہ بچپن کی یہ فضا نصیب ہو جائے۔ بعض لوگ تو شاعر کے ہاں اس سے بھی پیچھے ہٹنے کی آرزو کو کلبلاتا ہُوا دیکھ چکے ہیں اور اُنھوں نے شعر کے لبادے میں سے ماں کی گود کی ساری خوشبو بھی سُونگھ لی ہے مگر میں اس قسم کے جاسوسی پیشہ لوگوں کو سخت نفرت کی نظروں سے دیکھتا ہُوں۔ آخر جاسوسی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے اور پھر شاعر لوگ معاشرے کے شریف افراد بھی تو ہیں۔ اُن کے افکار کو خرگوش جان کر اُن کا پیچھا کرنا، کسی صُورت بھی جائز نہیں ہے۔

واپسی کی اس انسانی خواہش کا سب سے بڑا نباض داستان گو ہے۔ پُرانے قصّوں میں جب ہیرو اور ہیروئن آلام و مصائب سے گزر کر آخر ایک روز لقمۂ اجل ہو جاتے تھے تو داستان گو اپنی دستار کے تحفظ کے لیے یعنی سامعین کی گالی گلوچ سے بچنے کے لیے فوراً کہانی میں اس فقرے کا اضافہ کر دیتا تھا کہ مہربانو! اس کے بعد ہیرو اور ہیروئن سوُرگ یا جنّت میں دوبارہ زندہ ہُوئے اور بادل کے رنگین حجروں پر نیم دراز،

جنت کے شالامار میں ڈیوٹ گانے لگے" ——— اور سامعین، ہیرو اور ہیروئن کی حیاتِ نو یعنی واپسی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کا راستہ لیتے تھے۔ آج کا فلم پروڈیوسر اتنا ہی تجربہ کار ہے جتنا کہ پرانا داستان طراز! چنانچہ جب وہ اپنے کسی شہرۂ آفاق جاسوس یا قاتل کو ایک فلم میں کیفرِ کردار تک پہنچا لیتا ہے تو اگلی فلم میں اس کی "واپسی" کا اہتمام کر کے اہلِ وطن کو دوبارہ فلم دیکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ محض اس لیے کہ اسے پتہ ہے کہ ہم بے چارے قندِ مکرّر کا لطف لینے کے لیے ازل سے تیار بیٹھے ہیں۔

فلاسفروں نے زندگی کے ہر منظر کو واپسی کے عمل میں مبتلا دکھایا ہے اور اس ضمن میں ریاضی کے ہندسوں، اور اقلیدس کی لکیروں سے کچھ تجریدی مصوّری بھی کی ہے جو خوش قسمتی سے میری اور آپ کی سمجھ سے بالا ہے۔ لیکن ان کے نتائج کو تسلیم کرنے میں لطف سا محسوس ہوتا ہے کیونکہ وہ پھیلنے اور برابر پھیلتے چلے جانے کے لیے سمٹنے کے عمل کو ضروری قرار دیتے ہیں مثلاً الف اگر اپنی نسل کو آگے پھیلانا چاہتا ہے تو سمٹ کر اپنے بیٹے کا روپ اختیار کرے۔ اگر ج کوئی نمایاں تخلیقی کارنامہ سرانجام دینے کے مرض میں مبتلا ہے تو اوّلین فرصت میں اپنی ذات کی انڈرگراؤنڈ ٹرین کا ٹکٹ کٹائے اور وہاں سے روشنی کی مشعل لے کر باہر آ جائے۔ اگر

آپ خلقِ خُدا کو سچائی کا راستہ دکھانے کا آرزو مند ہے تو کسی بڑ کے درخت، کسی مچھلی کے پیٹ، کسی کشتی یا ریگستان کی طرف مراجعت کرے توبہ ہے! یہ فلاسفر لوگ بھی عجیب ہیں۔ انسان کی ایک ننّھی سی، معصوم سی آرزو سے کتنا غلط فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر انسان کی فطرت میں واپسی کا یہ نازک سا جذبہ موجود نہ ہوتا تو پھر میں دیکھتا کہ یہ فلاسفر کس طرح لاکھوں صفحات کالے کر کے خلقِ خُدا کے کرب میں اضافے کا موجب بنتے ہیں؟ —— وہ تو شاید ایک لفظ تک نہ لکھ سکتے!

واپسی کا تصور بڑا پُر لطف، خواب ناک اور مسرّت افزا ہے اور شاید اسی لیے میں ہر بار جب اپنا ایک قدم آگے کو بڑھاتا ہُوں تو واپس پلٹ جانے کی آرزو بھی کرتا ہُوں۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ مُستقبل تاریکیوں میں لپٹا، آسیب زدہ اور غیر یقینی ہے اور مَیں اس کی طرف بڑھتے ہُوئے ہزار وسوسوں کا شکار ہو جاتا ہُوں۔ ایسے سمے واپسی کی خواہش دفعتہً بھڑک اُٹھتی ہے۔ جی چاہتا ہے، ایک موٹا سا لحاف ہو یا ایک بالکل بند کمرہ جس میں مستقبل کی تیز نگاہی سے محفوظ مَیں لحظہ بھر کے لیے رُک سکوں ——

یہ ایک بالکل معصوم سی آرزو ہے جسے زندگی کے ہر نیم تاریک گوشے پر ماں کی گود کا گمان ہوتا ہے —— وہ گود جس میں راحت، پیار اور نیم بیداری کی کیفیت سدا موجود رہتی ہے۔ واپسی کی خواہش اسی کیفیت کے

مکرّر حصول کی ایک خواہش ہے اور بس! لیکن خود واپسی کا عمل شاید اس قدر پُر لطف اور مسرّت افزا نہیں۔ آپ کسی ایسے لمحے کی طرف مراجعت کرتے ہیں، جس کے بارے میں آپ کو یہ گمان ہے کہ وہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ماضی کے کسی پلنگ پر گھونگھٹ نکالے آپ کی واپسی کا منتظر ہوگا لیکن کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ ہر لمحے کو قدرت نے بڑے خوبصورت اور توانا پنکھ عطا کر رکھے ہیں۔ وہ کب کسی کا انتظار کرتا ہے! میں یا آپ جب اس لمحے کی بازیابی کے لیے مارے مارے واپس جاتے ہیں تو وہاں ٹوٹی ہوئی طناب، بکھری ہوئی راکھ اور کارواں کے بجھے ہوئے نقوشِ پا کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا —— یہی واپسی کا المیہ ہے!

کچھ ضربُ المثل کی مخالفت میں

عام دستور تو یہ ہے کہ اِدھر قیامت کا ذکر چھڑا اور اُدھر کھٹ سے بات ان کی جوانی تک جا پہنچی، لیکن کبھی کبھی یُوں بھی ہُوا ہے کہ بات جوانی کی چھِڑی اور پھر گویا قیامت ہی آگئی۔

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے!

"ہائے ہائے" کا اُمید افزا اور دلکش نعرہ خاص طور پر اس لیے اہم ہے کہ اس سے جوانی کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلی صُورت میں "جوانی" اُن کی تھی اور قیامت کی جُملہ صفات اس ناچیز کو حاصل تھیں۔ دُوسری صُورت میں جوانی اپنی ہے اور قیامت کی تمام قیامت خیزیاں اُن کی ہیں۔ پہلی صُورت قدرے خطرناک ہے کہ اِس میں مبتلا ہو کر آپ سب کچھ کرنے پر تُل جاتے ہیں۔ لیکن دُوسری صُورت میں بات یادوں کی

سر حد سے آگے نہیں جاتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی چندیا پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہیں اور وہاں آپ کو بالوں کے نشیب و فراز کے بجائے صحرا کی چٹیل سطح کا احساس ہوتا ہے یا آپ اپنے گالوں کو تھپتھپاتے ہیں اور آپ کی ہتھیلی میں رخسار کی نکیلی ہڈی چبھ جاتی ہے تو آپ حسبِ قاعدہ "ہائے ہائے" کا دلفگار نعرہ لگا کر صبر و شکر کر لیتے اور پھر سے اپنی ذات کے خول میں سمٹ جاتے ہیں لیکن جوانی کا ذکر ہمیشہ اس قدر سطحی نہیں ہوتا۔ مثلاً میرے دوست ع جب ان ایام کا ذکر کرتے ہیں۔ جب آتش جوان تھا (اور حق یہ ہے کہ ان کے ہاں آتش کچھ ضرورت سے زیادہ ہی جوان تھا) تو کبھی کبھی جوانی کی لذت کوشیوں اور جسم کی کیف سامانیوں سے دامن چھڑا کر جوانی کی آتشِ بغاوت اور گرمیِ گفتار کا بھی ذکر چھیڑ دیتے ہیں اور در اصل یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر وہ خلقِ خدا کی عام سطح سے اوپر اٹھ آتے ہیں۔ ع کے ہاں جوانی کے ذکر کی ابتدا عین روایتی انداز میں ہوتی ہے۔ وہ اپنے پاؤں اٹھا کر مونڈھے کے کنارے پر رکھ لیتے ہیں اور ہات بڑھا کر ان پر جمی ہوئی صدیوں کی میل کو بڑی چابکدستی سے اتارتے۔ لمبی لمبی "موم بتیوں" میں ڈھالتے اور اپنے اس عمل کے ساتھ ساتھ وقت کے دبیز پردوں کو نوچ کر الگ کرتے اور ان کے نیچے سے پوٹلیوں میں بندھی ہوئی جوانی کی یادوں کو نکال کر آپ

کے سامنے چُنتے چلے جاتے ہیں " جوانی کے دن بھی کیا تھے۔ پتھر کی مورتی سے بھی پیار کرنے کو جی چاہتا تھا "۔ خوفزدہ ہو کر چاروں طرف دیکھتے ہیں اور پھر " بڑی کرّیل جوانی تھی ہماری! جو کھاتے تھے فی الفور ہضم ہو جاتا تھا۔ آم کے موسم میں تو کپڑے اُتار کر زمین پر بیٹھ جاتے تھے اور اس قدر آم کھاتے تھے کہ گٹھلیوں کا انبار ٹھوڑی کو چھونے لگتا تھا "۔ لیکن کبھی کبھی ان روایتی باتوں کے عین درمیان وہ کوئی بڑی گہری بات بھی کہہ جاتے ہیں مثلاً کل شام اپنی جوانی کا ذکر کرتے ہوئے بے اختیار کہہ اُٹھے " واہ کیا جوانی تھی ہماری بھی! قسم لے لو جو کبھی کسی بزرگ کی نصیحت پر ہم نے عمل کیا ہو " اُن کی اس بات پر میں چونک پڑا اور پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ حضرتِ غ تو خاصے ذہین آدمی ہیں اور یہ کہ انھیں فلسفے سے ایک فطری لگاؤ بھی ہے۔ واقعتہً جوانی کے ایّام میں کون کسی کی سُنتا ہے! لیکن یہی " کون " جب جوانی کے لالہ زاروں کو عبور کر آتا ہے تو بڑے فخر سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے " برخوردار! ہم تو اپنے بزرگوں کی ہر بات سنتے تھے۔ سُبحان اللہ، کیا دن تھے! " دراصل نصیحت کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ ہر قسم کی رُکاوٹ یا ردِّ عمل کو پسِ پُشت ڈال کر بڑی ہٹ دھرمی کے ساتھ ایک نسل سے دُوسری نسل میں منتقل ہو جاتی ہے۔ جوانی اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے کہ اس نے اس عارضے کی نفی کر دی لیکن ہوتا یہ ہے

کہ اس کے جرثومے بڑی آہستگی سے اُس کے خون میں داخل ہوتے اور وہاں بڑی خاموشی سے اپنی جڑیں مضبوط کرتے رہے ہیں۔ ادھر جوانی کا خون سرد پڑا، چندیا پر سے بال اُڑے، دانتوں نے لڑکھڑا کر الوداع کہی اور ادھر جسم کے اندر چھپا ہُوا یہ عفریت مونچھوں پر تاؤ دیتا ہُوا برآمد ہوگیا۔ تاریخ اپنے اوراق اُلٹتی ہے۔ نسلیں اُبھرتی اور ڈوبتی ہیں۔ افراد پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں، لیکن نصیحت کا علَم ہمیشہ بلند رہتا ہے۔ اِسے کبھی فنا نہیں۔

نصیحت کو تو میں پھر بھی قابلِ عفو سمجھتا ہُوں، لیکن نصیحت کی بڑی بہن یعنی ضربُ المثل سے مجھے چڑ ہے۔ نصیحت میں کم از کم وہ زہر خند نہیں ہوتا جو ضربُ المثل سے خاص ہے۔ نصیحت کرنے والا ایک بے حد معصوم اِنسان ہوتا ہے جو نصیحت کرنے کے دوران میں کبھی اِس بات کو فراموش نہیں کرتا کہ اُس کا یہ عمل از سر تا پا ایک سعیِ لاحاصل ہے۔ خود اپنی جوانی کے ایّام میں اُس نے کب کسی کی نصیحت کو کوئی اہمیت دی تھی کہ اب اُس کے برخوردار اُسے اہمیت دینے لگیں؟ تاہم چونکہ رسماً اور اخلاقاً اُسے اِس عمل سے گزرنا ہوتا ہے، اِس لیے بادلِ نخواستہ وہ گزرتا ہے اور نصیحت وصول کرنے والا اسپورٹس مین شپ کا مظاہرہ کرتے ہُوئے بڑی عقیدت سے اس نصیحت کو وصول کرکے سُرخرو ہو جاتا ہے اور

بس! اِس سے نہ تو آج تک نصیحت کرنے والے کو کوئی صدمہ پہنچا اور نہ نصیحت سُننے والے کو اور اِس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اِس کھیل کے دونوں اداکار کھیل کے مزاج سے واقف ہیں اور اِس سے کوئی ایسی توقع وابستہ نہیں کرتے، جس کے فسخ ہونے پر انھیں کوئی صدمہ پہنچے۔ گویا نصیحت کے عمل میں نیک نیتی، مروّت اور روایت کا تحفّظ مقصود ہوتا ہے۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ نصیحت اثر کرے اور نصیحت وصول کرنے والا اس پر عمل کرنے کی حماقت کا مرتکب بھی ہو۔ نصیحت تو وزن کے ٹکٹ کی مانند ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر دوسرا ٹکٹ آپ کو نہ صرف مختلف وزن بتائے گا بلکہ آپ کی تقدیر کے سلسلے میں ہر بار مختلف قیاس آرائی کا مرتکب بھی ہوگا، لیکن ریل کے سفر کی روایات کے احترام میں آپ بڑی عقیدت سے لوہے کے ایک مختصر سے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر اپنے وزن کا ٹکٹ حاصل کرنے کا ایک مضحکہ خیز فریضہ سرانجام دینے میں کوئی حرج نہیں دیکھتے۔ بالکل اِس طرح کسی بزرگ کے پوپلے مُنہ سے نصیحت کے چند بے ضرر جُملے سُن لینے میں کیا حرج ہے؟ مجھے وہ نوجوان ایک آنکھ نہیں بھاتے جو نصیحت کی اِنسٹی ٹیوشن سے عدم واقفیت کی بنا پر جھلاہٹ اور برہمی کا مظاہرہ کرتے اور نصیحتوں کی یلغار کی صُورت میں اپنے بزرگوں سے اُلجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے!

نصیحت ایک قطعاً بے ضرر اور معصوم سا عمل ہے۔ جب کوئی کہتا ہے ع

نانک ننھے ہو رہو جیسی ننھی دُوب

یا

بیٹا ایسی ریت کر جیسی برچھ[1] کرے
اپنے اوپر دُھوپ سہے اوروں کو چھاؤں دے"

تو اِس سے یہ مُراد لینا بالکل غلط ہے کہ کہنے والے نے سنجیدگی سے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ صبح اُٹھتے ہی چوراہے میں جاکر لیٹ جائیں اور جب ٹریفک کا سپاہی آپ کو اُٹھانے کی کوشش کرے تو مسکرا کر

نانک ننھے ہو رہو جیسی ننھی دُوب

کے وِرد سے اس کا سواگت کریں یا پھر درختوں کی قطار میں جو جگہ آپ کو خالی نظر آئے، وہاں نقلی چوکیدار کی طرح کھڑے ہو کر اپنے سائے سے خلقِ خدا کو آرام بہم پہنچانے کی احمقانہ حرکت کے مُرتکب ہوں۔ نصیحت کا جذبہ اگر واقعتہً سنجیدہ ہوتا اور برخورداروں کا قافلہ اِس پر اسی سنجیدگی سے عمل پیرا ہوتا تو آج چوراہے کا سارا ٹریفک معطّل اور ہفتۂ شجرکاری کی ساری روایت ختم ہو گئی ہوتی۔ لیکن شُکر ہے کہ ایسا نہیں ہُوا اور ابھی اس جہانِ

[1] درخت

رنگ و بُو میں کچھ شجرکاری اور ٹریفک باقی ہے۔ تاہم نصیحت کا سارا عمل جذبے کی معصُومانہ ذہنیت کا غماز ضرور ہے اور اِسی لیے میں نصیحت کو کچھ زیادہ بُرا نہیں سمجھتا، لیکن ضربُ المثل! ضربُ المثل کے ذکر ہی سے میرا سانس رُکنے لگتا ہے۔ غور کیجیے کہ ضربُ المثل کا مقصد دُوسروں کا تمسخر اُڑانے اور اُن کی آواز کو دبانے کے علاوہ اور کیا ہے؟ ضربُ المثل کی ترکیب میں "ضرب" کا بولتا ہُوا لفظ بجائے خود اس کی تشدّد پسند ذہنیت کا غماز ہے۔ کہتے ہیں کہ جہاں خدا نے چار الہامی کتابیں نازل کیں وہاں ایک ڈنڈا بھی اُتارا۔ ڈنڈا ـــــــ جو ہزاروں برس کے استعمال کے بعد گھس پٹ کر "ضربُ المثل" میں ڈھل گیا۔ چنانچہ بظاہر تو ضربُ المثل پھُولوں سے لدی شاخ کی مانند ہے لیکن پھُولوں کو اُتار دیجیے تو نیچے سے ایک بے رحم ننگی سی چھڑی برآمد ہو جاتی ہے۔ چھڑی جس کی مدد سے سماج کا گلہ بان ہر بھٹکی ہُوئی بھیڑ کو ہانک کر دوبارہ گلّے میں شامل کر لیتا ہے۔ ضربُ المثل کا وِرد کرنے والے کی آنکھوں میں جو شریر سی مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے، اُس کے لہجے میں جو تمسخر اور تحکم جنم لیتا ہے اور اس کے الفاظ میں جو خفگی، تہدیدی انداز اور احساسِ برتری کی جھلک دکھائی دیتی ہے، میں تو اس کے تصوّر ہی سے کانپ اُٹھتا ہُوں۔

لوک گیت کی طرح ضربُ المثل کے خالق کا بھی آج تک کسی کو حسب

نسب معلوم نہیں ہو سکا۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ جب ساون کی گھنگھور گھٹائیں اُمڈ اُمڈ کر آتی ہیں۔ پپیہے درختوں میں اور شاعر مشاعروں میں شور مچاتے ہیں جب عاشق ململ کے کُرتے کے ازلی وابدی چاک کو درزی کے مشورے سے ٹِبا کر لیتے ہیں اور اکسپورٹ امپورٹ کے کاروبار میں مندے کا رُجحان پھیل جاتا ہے تو شہر کے شور وغل سے بہت دُور کسی پہاڑ کے دامن یا ندی کے کنارے یا کپاس کے کھیت میں کوئی پیرِ فرتوت اپنے تخیل کا مہمیز لگا کر یا اجتماعی ذہن کو ٹٹول کر ضرب المثل کا ایک پرانا کرم خوردہ نسخہ نکالتا ہے پھر آناً فاناً پھول کی خوشبو کی طرح یہ ضرب المثل چہار اطراف میں پھیل جاتی اور ہر ٹیکسی ڈرائیور کے ہونٹوں پر تھرکنے لگتی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بُوڑھا کوئی گوشت پوست کی ہستی نہیں بلکہ سوسائٹی کا وہ عمر رسیدہ ذہن ہے جو فرد کی انفرادیت کے عمل کو ہمیشہ بڑی حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہے اِدھر کسی ذہین نوجوان نے تخلیقی دباؤ کے تحت کوئی نیا دھندا شروع کیا، وزن اور بحر سے بے نیاز کوئی آزاد نظم لکھی، کسے کسائے لباس میں کوئی نئی پگڈنڈی اختیار کی یا خیال کا کوئی نیا پیکر تراشا اور اُدھر سوسائٹی کا بابا ضرب المثل کا ڈنڈا ہات میں لیے آ دھمکا اور نوجوان کو تمسخر، تحکم اور جراحت سے پسپا کرنے لگا۔ میں کہتا ہوں ضرب المثل تو وہ مائیکروفون ہے جس کی مدد سے سوسائٹی اپنی آواز کو دس گنا بڑھا کر پیش کرتی اور یوں

ان بہت سی ننھی مُنّی اور شیریں آوازوں کو دبا دیتی ہے جو اُس کے پروں کے نیچے سے نکلے ہوئے چوزے پیدا کرتے ہیں۔

لیکن ضربُ المثل کی ایک اور خصوصیت بھی ہے، بے شک اس کی آواز بہت بلند، پُرشکوہ اور گھمبیر ہے تاہم سوسائٹی کے عمر رسیدہ ذہن نے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ یہ آواز اس کے علاوہ مسحور کن بھی ہو اور اس میں ایسا نغماتی لوچ بھی ہو کہ ہر سُننے والا اس کی طرف پروانہ وار کھنچا چلا آئے۔ چنانچہ آپ دیکھیے کہ ہر ضربُ المثل میں ایک صوتی حُسن ہوتا ہے اور اس کی شعری کیفیت اور نغماتی زیر و بم سُننے والے کی حسیات کو تھپک تھپک کر میٹھی نیند سُلا دیتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر تو مُرغی کی آواز نے کبھی متاثر نہیں کیا، لیکن جب وہ ایک خاص انداز سے کڑک کڑک کا دلکش نغمہ بلند کرتی ہے تو صحن میں بکھرے ہوئے چوزے برق رفتاری سے لپک کر اُس کے قدموں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ بالکل یہی حال ضربُ المثل کا ہے کہ یہ سوسائٹی کے باغیوں کو ایک ایسے نغماتی زیر و بم میں اسیر کر دیتی ہے کہ وہ کچّے دھاگے سے بندھے اس کی جانب کھِچے چلے آتے ہیں۔ چنانچہ آپ شاید حیران ہوں کہ ضربُ المثل کی کڑک کڑک کو سُنتے ہی میری تمام فلسفیانہ موشگافیوں اور ازبر کیے ہوئے دلائل کو گویا سانپ سُونگھ جاتا ہے۔ مجھے یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے ضربُ المثل تو ایک دلکش لوری ہے اور اس کے

ہوتے ہوئے میری ذہنی اُپج یا اضطراری کیفیت کی نمو کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لیے مجھے ضرب المثل سے چڑ ہے کہ یہ میری ذات، میری انفرادیت کی نفی کر کے مجھے انبوہ کا ایک جُزو بننے پر مجبور کرتی ہے اور آپ جانتے ہیں، میں بھٹکی ہوئی بھیڑ تو کہلا سکتا ہوں، لیکن گلّے کی ایک اندھی بہری بھیڑ کا منصب مجھے کسی صُورت بھی قبول نہیں۔ کیا آپ کو قبول ہے؟

یہ معصوم لوگ

مجھے اپنے دوست ع سے شدید محبّت ہے اور میرا یہ دوست شاعری کے روایتی محبُوب کی طرح میری بجائے کسی اور پر جان چھڑکتا ہے۔ اگر آپ کو اس بات کا ثبوت درکار ہے تو میں یہ مشورہ دُوں گا کہ آپ سب سے پہلے صبح کی سیر کے عارضے میں چُپکے سے مُبتلا ہو جائیں اور صُبح اُٹھتے ہی دبے پاؤں میرے "یار" کی گلی سے گزرنے کی عادت ڈالیں۔ سُرخ اینٹوں والے مکان کے سامنے لحظہ بھر کے لیے رُکیں اور ٹکٹکی باندھے اس مکان کے چبُوترے کو دیکھتے رہیں۔ ابھی دس منٹ بھی نہیں گزریں گے کہ آپ کو ہڈیوں کا ایک سیہ فام ڈھانچا جانگیہ پہنے اور پانی کا فوّارہ ہاتھ میں لیے بیٹھک کے دروازے سے باہر آتا نظر آئے گا۔ باہر آکر وہ دو تین منٹ تک اس زور شور سے ورزش کرے گا کہ ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز گلی کے موڑ تک

سُنائی دے گی۔ اس کے بعد وہ اپنے بازوؤں کی مچھلیوں کو ٹٹولے گا اور اگرچہ یہ مچھلیاں محبوب کی "کمر" کی طرح مادّی نظروں سے اوجھل ہوں گی۔ تاہم وہ بازوؤں کی ہڈیوں کو تھپتھپا کر اُن کے وجود کا اعلان کرنے سے باز نہیں آئے گا اور پھر فوّارہ اُٹھا کر قطار اندر قطار رکھے ہوئے گملوں پر پانی کے علاوہ اپنی جان بھی چھڑکنے لگے گا۔ وہ ہر گملے کو پہلے غور سے دیکھے گا۔ اس میں اُگے ہوئے پھولوں کو انگشتِ شہادت سے چھُو کر ان کی نرمی اور ملائمت کا ایک تصوّر قائم کرے گا۔ گملے کو ناک تک اُٹھا کر پھول کی خوشبو سونگھے گا۔ ایک لمبا آسودہ سانس لے گا اور گملے کو کمال آہستگی سے اس کی اصل جگہ پر رکھ کر پانی دینے لگے گا۔ گملوں میں آپ کو طرح طرح کے پھول ہنستے مسکراتے اور شرارتیں کرتے نظر آئیں گے۔ اور میرا دوست دُنیا و مافیہا سے بے خبر اس معصوم مخلوق کی معیت میں زندگی کے بہترین لمحات بسر کرتا چلا جائے گا۔ حتیٰ کہ گلی جاگ اُٹھے گی بچّے اور مُرغ شور مچانے لگیں گے۔ جھاڑو کی ضربوں کی کرخت آواز بلند ہونا شروع ہو گی اور کمیٹی کے نل پر برتن آپس میں ٹکرانے لگیں گے۔ اس وقت کوئی بُوڑھا آدمی حُقّے کے کش لیتا اپنے مکان کے تھڑے پر آ بیٹھے گا اور مُشتبہ نظروں سے آپ کی طرف دیکھے گا اور آپ اس کی تیز نگاہی کی تاب نہ لا کر آہستہ آہستہ کھسکنے لگیں گے۔

عین اُس وقت ہڈیوں کا یہ پنجر جس سے مجھے والہانہ پیار ہے۔ اپنے پھولوں کو آخری بار پیار بھری نظروں سے دیکھے گا اور جس خاموشی سے باہر نکلا تھا۔ اسی خاموشی سے ٹاٹ کا پردہ اُٹھا کر اندر چلا جائے گا۔ اِس کے بعد دیر تک پردے کے پیچھے سے تُو تُو مَیں مَیں کی آوازیں آتی رہیں گی۔ مگر یہ ایک الگ داستان ہے!

مجھے ہڈیوں کے اس ڈھانچے سے والہانہ پیار ہے اور مَیں صُبح کی میٹھی نیند سے محض اِس لیے دست بردار ہو جاتا ہُوں تاکہ اس "عجوبۂ فطرت" کو پھُولوں کے کُنج میں بھونرے کی طرح پھرتے ہُوئے دیکھ سکوں اور یہ منظر بھی عجیب ہوتا ہے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا چبوترے کے قریب آ جاتا ہُوں اور کَل کی طرح چلتے ہُوئے ایک انسانی پنجر کو بڑے غور سے دیکھنے لگتا ہوں۔ کبھی کبھی کسی شوخ چشم پھُول سے متاثّر ہو کر اپنا ہاتھ بڑھاتا ہُوں تاکہ اسے توڑ سکُوں، لیکن ابھی یہ ہاتھ پھُول سے دُور ہی ہوتا ہے کہ میرے دوست کی قہر آلُود نظریں برقی رو کی طرح بڑھ کر اس ہات کو مفلُوج کر دیتی ہیں اور یہ ہَوا میں معلق ہو کر رہ جاتا ہے۔ پُرانی کرم خوردہ کتابوں کے جادُوگر بھی شاید ایسے ہی سیاہ فام ڈھانچے ہوں گے۔ جو پھُول ایسی شہزادیوں کو دیوؤں کے بڑھتے ہُوئے ہاتھوں سے محفُوظ رکھنے کے لیے جادو سے کام لیتے تھے۔ بہر حال میں اِس کالے

جادُو کی تیز نگاہی کی تاب نہ لا کر ہات کھینچ لیتا ہُوں اور پھُولوں میں دلچسپی لیتے ہُوئے اپنے دوست سے پُوچھتا ہُوں "یار! بتا تو ان پھُولوں کے کیا نام ہیں؟" یک لخت جیسے کسی ستار کے تار کھنچ جائیں۔ میرے دوست کی ہڈّیاں سکڑ کر لمبی ہو جاتی ہیں اور ان ہڈیوں سے شعلے سے نکلنے لگتے ہیں اور وہ فوّارے کو زمین پر رکھ کر غُصّے سے تھرّانے لگتا ہے پھر جب اسے یقین آ جاتا ہے کہ میں اس کا دوست ہُوں، کوئی غیر نہیں ہُوں تو بڑی آہستگی اور معصُومیّت سے جواب دیتا ہے ـــــ "پھُول پھُول ہے۔ کبھی پھُول کا بھی کوئی نام ہوتا ہے؟" ـــــ دفعتہً خفّت کا بادل میری ذات پر محیط ہو جاتا ہے۔ مجھے محسُوس ہوتا ہے جیسے گملوں کے سارے پھُول یک لخت کھلکھلا کر ہنس پڑے ہیں اور میرے دوست کی آنکھوں میں تمسخر ناچنے لگا ہے۔ اس وقت میں اس معصُوم مخلوق سے اپنی آنکھیں چار نہیں کر سکتا اور بھاگ کر اپنی کوٹھڑی میں آ جاتا ہوں۔

پھر جب خفّت کے بادل چھٹنے لگتے ہیں تو میں سوچتا ہُوں کہ اس ہڈیوں کے پنجر نے کیسی سچّی بات کہہ دی ہے۔ واقعتہً پھُولوں کے نام رکھنا بد مذاقی کے سوا اور کچھ نہیں۔ فطرت کا ذوقِ نمُو ہزاروں لاکھوں پودوں کو زمین کا سینہ چیر کر باہر نکلنے کی ترغیب دیتا ہے اور اگرچہ فطرت ان پودوں کو تنوّع بخشنے میں بخل سے کام نہیں لیتی تاہم ایسا

کبھی نہیں ہُوا کہ فطرت نے اِن پودوں کی پیشانیوں پر ان کے نام بھی کندہ کر دیئے ہوں ۔ فِطرت کے دربار میں پودا، پرندہ، اِنسان غرضیکہ ہر ذی رُوح "نام" سے بے نیاز ہے ۔ اُس جھکی ہُوئی نازک شاخ پر بیٹھی اُس خوبصورت سی سُنہری چِڑیا کا نام کیا ہے اور اس جیسی ہزاروں نازک اور سُنہری چِڑیوں کے کیا نام ہیں ۔ فطرت نے کبھی اِس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ تفریق اور تقسیم کے مصنُوعی عمل سے کام لے ۔ یہ تو انسان کا کارنامہ ہے کہ وہ محض اپنی سہولت کی خاطر ان نازک پرندوں، پھولوں اور بچّوں کو نام عطا کر کے حُسن، معصومیت اور پاکیزگی کو داغدار کر دیتا ہے ۔ مِیٹھی اور رسیلی آواز والی شب رنگ چِڑیا کو کوئل، سُرخ، زرد اور سفید چاندی کے ورق ایسے پھُولوں کو پارِ جِولا کا اور گھنگھریلے بالوں، سیب کی طرح سُرخ گالوں اور چشمے کی طرح شفّاف آنکھوں والے بچّے کو جابر خاں کا نام دے کر بد مذاقی، تصنّع اور فریب کی مُنہ بولتی تصویر بن جاتا ہے اور پھر اس پر فخر کرتا ہے کہ اُس نے ہر ذی رُوح کو مَوت سے قبل نمبروں اور ناموں اور مَوت کے بعد کتبوں اور قبروں میں مقیّد کر لیا ہے ۔ کیسی عجیب بات ہے !

پھر جب خفّت کے بادل بالکل چھٹ جاتے ہیں اور مطلع صاف ہو جاتا ہے تو میں سوچتا ہُوں کہ پھُول کو نام عطا کرنا ہی نہیں، اسے توڑنا بھی

بدمذاقی کی دلیل ہے۔ اُردُو شاعری میں گل چیں یُونہی بدنام نہیں۔ شاعر حضرات چُونکہ حسّاس ہوتے ہیں، اِس لیے ہمیشہ اپنے کلام میں پھُول توڑنے کی مذمّت کرتے ہیں اور کم سے کم اِس میدان میں تو اُن کی سماجی حیثیت سے اِنکار ناممکن ہے۔ بے شک وہ کبھی کبھی "اے خانہ براندازِ چمن" کا وِرد کرتے ہُوئے پھُولوں کا تحفہ قبُول کرنے کے لیے اِنتہائی عامیانہ اندازِ تکلّم اختیار کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ لیکن اِس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ پھُول توڑنے کے بھی مرتکب ہُوئے ہیں۔ پھُول تو شاخ پر ہی اچھّا لگتا ہے اور اسے وہیں اپنی عُمرِ عزیز کاٹ لینے کی اِجازت مِلنی چاہیے اور پھر اُس کی عُمرِ عزیز ہوتی بھی کیا ہے؟ جو پھُول صُبح کو کھلتا ہے وُہ شاذ ہی شام تک زندہ رہتا ہے، مگر اِن چند گھنٹوں میں یہ ننّھا سا پیارا سا مُسافر زندگی کی تمام منازل سے گزرتا اور کائنات کی دِلفریب قوس کو نہایت خُوبصورتی سے جنم دے دیتا ہے۔ مُنہ اندھیرے جب نسیمِ صبح کا پاگل جھونکا اٹکھیلیاں کرتا باغ سے گزرتا ہے تو اَدھ کھلے پھُول کی آنکھوں میں ننّھے ننّھے آبدار موتیوں کو دیکھ کر چونک اُٹھتا ہے۔ یہ پھُول کا بچپن ہے۔ پھر جب سُورج سوا نیزے پر آجاتا ہے تو اِسی جھونکے کا لمس پھُول کو کھلکھلا کر ہنس دینے کی ترغیب دیتا ہے اور پھُول کی پتّیاں ایک عجیب شرارت بھرے انداز میں کھُلنے اور بند ہونے لگتی ہیں۔ یہ پھُول کا لڑکپن ہے۔ دوپہر تک پھُول

پُوری طرح کھل جاتا ہے اور اس کے ہر بُنِ مُو سے ایک پاگل کر دینے والی خوشبو نکل کر کالے کالے لاتعداد بھونروں کو بے تاب کر دیتی ہے۔ یہ پھُول کی جوانی ہے۔ دوپہر ڈھلتے ہی پھُول کا بدن کسی پھلدار شاخ کی طرح، کسی بھرپُور عورت کی مانند اپنے ہی بوجھ سے جھُکنے لگتا ہے۔ یہ ایک نئی زندگی کا آغاز ہے۔ شام کا منظر دیکھنے کی مجھے تاب نہیں۔ فرشِ خاک پر بکھری ہوئی پتیاں حسین یادوں کی طرح ہوا کے ہر جھونکے پر اپنا سر اُٹھاتی ہیں اور جب آنے والا نہیں آتا تو گھٹنوں پر سر رکھتے تادیر گم سم بیٹھی رہتی ہیں۔ یہ پھُول کا انجام ہے۔

پھُول کی اِس حیاتِ مختصر، اِس عظیم کارکردگی سے قطعِ نظر کر کے جب کوئی بدمذاق اُسے توڑ کر اپنے بالوں میں لگانے لگتا ہے تو میں اپنے بال نوچ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ جب وُہ باز نہیں آتا تو اپنے سبز فام جادوگر کو آواز دیتا ہوں تاکہ وہ ایک ہی قہر آلود نظر سے گل چیں کے بڑھتے ہوئے ہات کو مفلوج کر دے۔ مگر میری بدنصیبی کہ عین اُس وقت میرا یہ دوست ٹاٹ کے پردے کے پیچھے خود کسی گل چیں کے بڑھتے ہوئے ہات کی زد میں ہوتا ہے۔ افسوس!!

کچھ رشتہ داروں کی شان میں

خدا کی قدرت ہے کہ رشتہ دار تو آسمان سے نازل ہوتے ہیں، لیکن دوست احباب زمین سے اُگتے ہیں۔ خدانخواستہ اس سے میری یہ مراد ہرگز نہیں کہ رشتہ دار فرشتوں کی سی معصومیت اور تقدّس کے امین ہیں؛ جبکہ دوست احباب خود غرضی اور مادہ پرستی کے علَم بردار! تا حال میرا ذہنی توازن اِتنا نہیں بگڑا کہ میں اس قسم کی غلط بیانی کا مُرتکب ہوں اور پھر جدید علامت پسند شاعر کی طرح اپنی بات پر اڑا بھی رہوں۔ خدا کی قدرت کا ذکر میں نے محض اس لیے کیا ہے کہ یہ میرے موقف کی حمایت کرتی ہے۔ میں کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ رشتہ دار اللہ میاں کی طرف سے عطا ہوتے ہیں اور آپ چاہیں یا نہ چاہیں وہ بزورِ شمشیر آپ سے اپنی رشتہ داری قائم رکھتے ہیں، لیکن دوست احباب کے انتخاب میں اللہ قطعاً دخل نہیں دیتا۔

اور بعد ازاں جب آپ اللہ سے دُعا مانگتے ہیں کہ اے مظہر العجائب!
تو مجھے اِس آفت سے بچا تو وہ مُسکرا کر آپ کی بات سُنی اَن سُنی کر دیتا ہے
بہر حال اِس خاص معاملے میں مجھے اللہ سے قطعًا کوئی شکوہ نہیں۔ میں نے
دوست بناتے وقت ملاءِ اعلیٰ سے کب مشورہ کیا تھا کہ اب مصیبت میں مبتلا
ہونے کے بعد اُس سے کسی قسم کی "ایڈ" طلب کروں! چنانچہ میں وہی کرتا
ہوں جو ایسے موقعے پر ہر بھلے مانس کو کرنا چاہیئے یعنی اِس "آفت رسیدہ"
دوست کو آفت زدہ "علاقہ" قرار دے کر اس سے دستبردار ہو جاتا ہوں اور
باقی زندگی امن اور چین سے بسر کرنے کے خواب دیکھتا ہوں لیکن رشتہ داروں
کے معاملے میں میری ساری منطق دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ وجہ
اِس کی یہ ہے کہ رشتہ دار براہِ راست ملائے اعلیٰ سے متعلق ہیں اور اُسی
کے اشاروں پر سرگرم عمل رہتے ہیں۔ میں چاہوں بھی تو ان سے پیچھا نہیں
چھڑا سکتا۔ کیونکہ ان سے میرا رشتہ کسی پانچ سالہ منصوبے کے تابع
نہیں بلکہ خون اور گوشت کے ذریعے قائم ہے، بلکہ اب تو میرا یہ خیال
ہے کہ اللہ میاں سزا و جزا کا سارا کام رِشتہ داروں سے لیتے ہیں! اور
اِس کام کی تکمیل کے لیے اُنھوں نے دو موٹے تازے "رِشتہ دار"
ہر اِنسان کے شانوں پر مستقلاً بٹھا رکھے ہیں۔ جو اِس بے چارے کی
حیاتِ مختصر کو ایک مستقل کرب میں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ اِسی لیے تو

میں کہتا ہوں کہ دوست احباب زمین سے متعلق ہیں۔ یہ وہ دھاگے ہیں، جنھیں آپ جب چاہیں آسانی سے توڑ سکتے ہیں، لیکن رشتہ دار وہ غیر ارضی مخلوق ہے جو نظر نہ آئے تو بھی اس کا بوجھ آپ کو ہمہ وقت محسوس ہوتا ہے۔ آپ اس سے نجات نہیں پا سکتے!

رشتہ داروں کی اقسام اَن گنت ہیں، لیکن اِن میں سے معروف ترین قسم "مکانی رشتہ داروں" کی ہے۔ یہ رشتہ دار محض اِس لیے مکانی نہیں کہلاتے کہ آپ کے کسی بزرگ کی غلطی کے باعث اُن کے مکان کی پشت مستقلاً آپ کے مکان کی پُشت سے چپکی ہوئی ہے بلکہ اس لیے بھی کہ ان کے مکان کے صدر دروازے سے جو مخلوق برآمد ہوتی ہے، بلا روک ٹوک آپ کے مکان کے صدر دروازے میں داخل ہونے کی مجاز ہے۔ اس کے نتیجے میں "گرم گفتاری" اور ایک دوسرے کے حسب و نسب کے بارے میں تازہ ترین تحقیقات کو منظرِ عام پر لانے کی جو روایت قائم ہوئی ہے اس کا ذکر لاحاصل ہے۔ کیونکہ یہ بات تو "ایوانِ رشتہ داری" کو کمزور نہیں بلکہ مضبوط ہی بناتی ہے۔ مکانی رشتہ داری کے ماہرین کا تو یہ بھی خیال ہے کہ جب تک اس تعلقِ خاطر میں لین دین، سوال وجواب اور طعن و تشنیع کی چاشنی شامل نہ ہو، اس رشتہ داری کی پائداری ہی محلِ نظر ہے۔ بہر حال مکانی رشتہ دار وہ خارش ہے جو آپ کی پنڈلی پر

نمودار ہو گئی ہے۔ اس کا موجود رہنا ایک مستقل ذہنی کرب کا باعث ہے۔ تاہم جب آپ پنڈلی کو کھجلاتے ہیں تو اس سے آپ کو لطف بھی حاصل ہوتا ہے۔

دُوسری قسم "لامکانی" رشتہ داروں" کی ہے۔ اس لقب کا باعث یہ نہیں کہ اس مخلوق کو ہجرت کے بعد کوئی مکان الاٹ نہیں ہُوا تھا بلکہ یہ لقب تو اُس کی مستقل آوارہ خرامی اور دشت نوردی کی صفت کو اُجاگر کرتا ہے۔ لامکانی رشتہ دار کہیں سے بھی آپ کو "ایس۔او۔ایس" بھجوا سکتے ہے اور بعض اوقات تو کاموں کی، ماچھی کی اور چیچو کی ملیاں ایسے معروف اور صحت افزا مقامات سے بھی آپ کو اس کا خط یا تار مل سکتا ہے، جس میں اُس "بلائے ناگہانی" کا ذکر ہوتا ہے جو ازل سے اُس کے تعاقب میں تھی، لیکن جو آج پردیس میں اُس پر غالب آگئی ہے۔ یہ بلائے ناگہانی، اچانک بیماری، جیب تراش یا شحنہ — ان میں سے کوئی بھی صُورت اختیار کر سکتی ہے۔ اُس وقت آپ کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا کہ آپ اُسے رقم بذریعہ تار بھجوائیں یا ضمانت کے لیے بنفسِ نفیس تشریف لے جائیں۔ دونوں صُورتیں آئینِ رشتہ داری کی ہر دفعہ کے تحت جائز اور مستحسن ہیں۔

تیسری قسم "زمستانی" رشتہ داروں" کی ہے۔ ان رشتہ داروں پر

مجھے بڑا فخر ہے۔ موسمِ سرما کے آغاز میں جب مُرغابی شمال کے برف زاروں
سے نکل کر جنوب کے نسبتہً گرم علاقے کی طرف آتی ہے تو اس کے عقب
میں میرے یہ زمستانی رشتہ دار کاندھوں پر بیلچے، جیبوں میں نسوار کی ڈبیاں
اور پشت پر چھوٹے چھوٹے بستر باندھے، شمال سے جنوب کی طرف بے محابا
بڑھے چلے آتے ہیں۔ پچھلے دنوں میں نے اپنے چچازاد بھائی ا۔ ا سے (جو
ان دنوں ایک کالج میں پروفیسر ہیں) کہا کہ اگر آج سے ایک سو برس پہلے
ہمارے بزرگ یہاں آکر اقامت پذیر نہ ہو گئے ہوتے تو آج میں اور آپ
بیلچے اُٹھائے دیواریں بنانے میں بُری طرح مصرُوف ہوتے۔ میری یہ بات
سُن کر ا۔ ا جھینپ سے گئے، حالانکہ اس میں شرمندہ ہونے کی قطعًا کوئی
بات نہیں۔ یُوں بھی ہم اپنے آبائی پیشے کو ہزار چھپانے کی کوشش کریں،
ہمارے یہ زمستانی رشتہ دار سارا بھانڈا چوراہے میں پھوڑ دیتے ہیں۔ وہ
جب اپنے سفر کے دوران میں چند ایک راتیں ہمارے گاؤں میں گزارتے ہیں
تو بطورِ خاص مجھے اپنی "برادری" کا ایک رُکن سمجھ کر رات کا کھانا میرے
ہاں سے کھانے پر اصرار کرتے اور میرے مکان کی پختہ دیوار کو گرا کر اس
کی جگہ رعایتی قیمت پر ایک کچی دیوار کھڑی کرنے کی آفر بھی دیتے ہیں اور
یہ محض اس لیے کہ میں ان کا "رشتے کا بھائی" ہُوں۔ شکر ہے کہ میرے
یہ زمستانی رشتہ دار گرمیوں سے پہلے پہلے مُرغابی کے تعاقب میں شمال

کی طرف پرواز کر جاتے ہیں، ورنہ میرے لیے ان کی ذات پر مستقلاً فخر کرنا بہت مشکل ہو جائے۔

آخری قسم زمانۂ جدید کی پیداوار ہے اور "انسانی رشتہ دار" کہلاتی ہے کسی زمانے میں اس مخلوق نے خلقِ خدا کو بورژوا اور پرولتاری میں تقسیم کر کے خود کو محض "پرولتاری برادری" تک محدود کر دیا تھا۔ لیکن بین الاقوامیت کی ایک شدید تر رو نے اس تقسیم کو قریب قریب دریا برد کر دیا ہے۔ اب "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند"! اور ہمسایے سے آپ کی رشتہ داری اتنی ہی مضبوط متصور ہوتی ہے، جتنی ریل میں سفر کرتے ہوئے مسافر سے! اس برادری کے علمبردار "انسان اور آدمی" میں کبھی کبھی پھوٹ ڈلوانے کی کوشش بھی کرتے ہیں تاہم عام طور سے انسان اور آدمی کو مترادف قرار دے کر ان کی شان میں گرم گرم نظمیں لکھتے اور اداریے تحریر کرتے ہیں۔ سارے جہاں کا درد ان لوگوں کے جگر میں ہے۔ صحرائے گوبی میں بگولہ اُٹھے یا دریائے ینگ سی کیانگ میں "کانگ" آئے، لندن میں کوئی عمارت گرے یا لنکا میں ریل پٹڑی سے اُتر جائے، یہ لوگ انسانی رشتہ داری کی ٹیس کے تحت فوراً چندہ جمع کرنے کی مُہم شروع کر دیتے ہیں۔ میرے ان رشتہ داروں کی تحویل میں پرائیویٹ رسید بُکیں کثیر تعداد میں سدا موجود رہتی ہیں اور وہ صبح اخبار دیکھ کر اپنے موقف میں حسبِ ضرورت

ذرا سا ردّ و بدل کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے ہیں۔ انھیں دُنیا جہان کے انسانوں سے ہمدردی ہے۔ ان کی خاطر وہ جان تک دینے کو تیار ہیں۔ اس مہم میں اگر اُنھیں کسی شخص سے ہمدردی نہیں تو وہ "آپ" کی ذات ہے۔ دراصل اس "انسانی برادری" کی اساس ہی اخوت اور محبت کے جذبے پر استوار ہے۔ اب اگر اس جذبے کی زد پر آپ ہی ہر بار آئے ہیں تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ انسانی برادری بلکہ رشتہ داری کے اس مسلک میں کوئی بنیادی سقم بھی ہے؟

مجھے رشتہ داروں کی اس ساری قوم سے ایک شدید خوف محسوس ہوتا ہے۔ جب میں اپنے مکانی، لامکانی، زمستانی یا انسانی رشتہ داروں پر ایک نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ سب رشتہ دار کلوروفارم کے مختلف اجزاء ہیں اور یہ اجزاء ایک مرکّب بن کر میرے نتھنوں میں داخل ہو گئے ہیں اور مجھ میں حرکت کرنے کی آرزو ہی باقی نہیں رہی۔ لیکن کلوروفارم سے انھیں تشبیہ دینا ٹھیک نہیں۔ کیونکہ کلوروفارم کی یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کو سُلا دیتا ہے اور وہ اُس خوف سے محفوظ ہو جاتا ہے، جو رشتہ داروں کی موجودگی میں مجھے ہمیشہ محسوس ہوا ہے۔ سچ یہ ہے کہ رشتہ داروں کو اپنے اردگرد پا کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ سب مکڑی کے وہ دھاگے ہیں جو میری گردن میں طوق و سلاسل بن کر جھول رہے ہیں

اور میں ازل سے ان کے رحم و کرم پر ہوں۔ لیکن شاید ازل والی بات کچھ ایسی درست نہیں، کیونکہ میرے مُورثِ اعلیٰ یعنی آدم کو جنّت کا وہ ابتدائی دَور بھی تو عطا ہُوا تھا جو رِشتہ داروں کی عدم موجُودگی کے باعث ہی جنّت کہلانے کا مستحق تھا۔ اُس دَور میں آدم اپنی ذات، اپنی انفرادیت میں کس قدر مگن اور بندھنوں اور زنجیروں سے کس قدر آزاد تھے! لیکن کب تک؟ ایک روز اللہ میاں نے آدم کو اُن کا پہلا رِشتہ دار عطا کیا اور وہیں سے اُس لیپے کا آغاز ہُوا، جس کی ڈور میری ذات تک بڑھتی چلی آئی ہے۔ اب میں قطعاً اس ڈور کے رحم و کرم پر ہُوں، برادری، ہم وطنی اور انسان دوستی کے سُنہری ناموں نے میری ذات کو پھُول کی طرح کھِلنے اور اپنی مخصُوص خوشبو پھیلانے کی قوّت سے محرُوم کر دِیا ہے۔ بلکہ اب تو مَیں کبھی کبھی سوچتا ہُوں کہ رِشتہ داری کی یہ لعنت محض اِس لیے قائم ہے کہ آدم کو ابھی تک تنہا زندگی بسر کرنے کی وہ قوّت حاصل ہی نہیں ہو سکی جو آغازِ کار میں اُس سے چھین لی گئی تھی۔ جس روز ایسا ہو گیا، اِس بات کو طے سمجھیے کہ آدم نے اپنی کھوئی ہُوئی جنّت دوبارہ پا لی! اور شاعر بھی تو کہہ گیا ہے:

بہشت آنجا کہ رِشتہ دارے نباشد
کسے نہ با کسے کارے نباشد!

تصرف سے شعر کے وزن میں جو گڑبڑ پیدا ہوئی ہے، اُس کے لیے
میں ضرور شاعر کی رُوح سے معذرت کرتا، لیکن مجھے ایک جدید نظم گو
کرم فرما نے یقین دلایا ہے کہ یہ "گڑبڑ" جائز ہے اور مجھے گھبرانا نہیں چاہئیے
میں نے ان کی بات فوراً مان لی ہے کیونکہ "شاعر بھائی" ہونے کی حیثیت
سے وہ میرے تازہ ترین رشتہ دار ہیں اور مجھے اپنے رشتہ داروں بالخصوص
تازہ ترین رشتہ داروں سے بڑا ڈر لگتا ہے!

درمیانہ درجہ

رات کا پچھلا پہر ہے۔ ریل گاڑی فراٹے بھرتی اُڑی چلی جارہی ہے گرمی اور حبس کی فضا کو آنے والی صبح کی نیم خنک، بھیگی ہوئی ہوا مس کرنے لگی ہے اور غنودگی میں ڈوبی ہوئی گردن زمیں بوس ہونے کی سعیِ مسلسل میں مُبتلا ہے کہ دفعتہً میرے اندر کا گارڈ شعور کی کھڑکی پر دستک دے کر فریدؔ کو اُس کی منزل کے قرب کا احساس دلاتا ہے اور فرید میاں ہڑبڑا کر بیدار ہو جاتے اور اپنی بوجھل آنکھوں سے نیند کو بھگانے کے لیے کمپارٹمنٹ کا بلب روشن کر دیتے ہیں۔ پھر وہ کھڑکی میں سے اپنی گردن باہر نکال کر تادیر پیچھے کی طرف بھاگتی ہوئی جھاڑیوں اور کھیتوں میں ارضِ وطن کے کسی آشنا نشیب یا فراز کو نظر کی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں اور اُس کے بعد تادیر اپنی دائیں آنکھ میں سے کوئلے کا وہ ریزہ

نکالنے میں مصروف رہتے ہیں جو ریل کی کھڑکی سے باہر جھانکنے والے ہر مُسافر کو مفت عطا ہوتا ہے۔

لیکن یہ صورتِ حال درمیانے درجے کے مسافر کو ہی درپیش ہے۔ اُونچے درجے میں سفر کرنے والا تو ٹھنڈی میٹھی فضا میں لمبی تانے سویا رہتا ہے اور منزل کے قرب کا اندیشہ اُس کے لیے سوہانِ رُوح نہیں بنتا۔ اُس کے پاس نہ تو زادِ راہ کی کمی ہے اور نہ اسے اِس خدشے کا سامنا ہے کہ منزل پر پہنچنے کے بعد اُسے زمان و مکان کی اُلجھنوں میں گرفتار ہونا پڑے گا۔ سکون، طمانیت اور اعتماد کی اِس فضا میں اندر کے کسی گارڈ کی مجال نہیں کہ اس کے سینے پر دستک دے ــــــ کچھ یہی حال نچلے درجے کے مسافر کا ہے۔ خدشے یا اُلجھن سے یہ شخص بھی بے نیاز ہے۔ وہ اوّل شام سے اپنے ایک فٹ چوڑے تختے پر براجمان ہے اور یہ جانتے ہوئے کہ اگر اُس نے ذرا بھی پہلو بدلا تو اُس کے شانے سے لگ کر بیٹھا ہوا مُسافر اپنی مملکتِ خداداد میں اضافے کی فوراً کوشش کرے گا۔ وہ پتھر کے بُت کی طرح بے حس و حرکت آخری اسٹیشن تک بیٹھا رہتا ہے۔ نیند کی پریاں اُس کی تنہائی میں مُخل نہیں ہوتیں اور اُس کی دُھلی دُھلائی شفاف آنکھیں ہر طرح کے رنگین خواب سے قطعاً محفوظ رہتی ہیں۔

اُونچے درجے کا مسافر اطمینان سے گہری نیند سوتا ہے، اور نچلے درجے

کا مسافر سونے کی بد عادت میں مبتلا ہی نہیں۔ اس لیے خواب ان میں سے کوئی بھی نہیں دیکھتا۔ خواب تو صرف درمیانہ درجے کے مسافر کے لیے مختص ہیں۔

اور یہی اس کا المیہ بھی ہے! انٹر کلاس کا یہ مسافر رات بھر خواب دیکھتا ہے۔ کبھی نرم اور سُبک اور کبھی ڈراؤنے اور بھیانک خواب! ہر بار جب گاڑی پہلو بدلتی ہے۔ انجن ایک لمبی، دل ہلا دینے والی چیخ مارتا ہے یا چھابڑی والا کھڑکی کے عین نیچے کھڑے ہو کر اُسے گلے کی ساری قوت سے "جلیبی" کے وجود کا احساس دلاتا ہے تو اس مسافر کے خوابوں کا لامتناہی سلسلہ صرف لحظہ بھر کے لیے ہی ٹوٹتا ہے، کیونکہ دوسرے ہی لمحے گاڑی کے ہلکورے اُسے پھر سے خوابوں کی پُراسرار دنیا میں بہا لے جاتے ہیں اور وہ از سرِ نو امنگوں، آرزوؤں اور وسوسوں کے تانے بانے میں اُلجھ جاتے ہیں۔

انٹر کلاس کے مسافر کی حالت قابلِ رحم ہے۔ بعض ناتجربہ کار لوگ کچھ یوں سوچنے لگتے ہیں کہ چلو، تیسرے درجے سے تو انٹر کلاس بہر حال بہتر ہے، لیکن یہ ان کی غلطی ہے۔ اس غلطی کا احساس انٹر کلاس کے مسافر کو ہر رات ہوتا ہے، جب وہ گاڑی کے حرکت میں آتے ہی محبت اور نفرت، راحت اور دُکھ، ذات اور غیر ذات کے درمیان ایک بنڈُولم

کی طرح ہلنے لگتا ہے اور ہلتا ہی چلا جاتا ہے۔ نچلے درجے کے مسافر کو ایسے کسی ہنڈولم کا سامنا نہیں۔ وہ خوب جانتا ہے کہ اس کا ڈبہ نیچے سے اوپر اور اندر سے باہر تک تھرڈ کلاس کا ڈبہ ہے۔ اسے روزِ ازل کارکنانِ قضا و قدر یعنی آسمانی انجنیئروں نے صرف نچلے درجے کے مسافر کے لیے تعمیر کیا تھا اور یہ ڈبہ ابد تک اپنے اس مزاج اور وصف سے دستبردار نہیں ہوگا۔ تھرڈ کلاس کا مسافر اس لڑکے کی طرح نہیں جس کا نام اللہ دین تھا اور جس نے چراغ کو رگڑ کر تصور ہی تصور میں اپنے لیے ایک عالی شان محل تیار کر لیا تھا۔ یہ اللہ دین تھرڈ کلاس کا نہیں، انٹر کلاس کا مسافر ہے کیونکہ وہ شام سے صبح تک خواب دیکھنے کے مرض میں مبتلا ہے۔ وہ اپنے وجود، اپنی کائنات، اپنے مقدر سے مطمئن ہی نہیں۔ اور سدا لکڑی کی سخت اور جامد دیوار میں نقب لگا کر اس کے آگے بجتے ہوئے کسی اونچے محل نما ڈبے میں قدم رکھنے کے منصوبے بناتا رہتا ہے۔ بھلا ایسے شخص کو شانتی کہاں نصیب ہوگی لیکن نچلے درجے کا مسافر کردار کی اس سیمابیت اور "اللہ دینیت" سے بالکل محفوظ ہے۔ وہ کسی احمقوں کی جنت کا باسی نہیں۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے نیچے لکڑی کا ایک سخت تختہ ہے اور اس کے سر پر لکڑی کے ایک اور موٹے تختے کا سایہ ہے۔ اس کے دائیں اور بائیں دو ٹرائے کے

چوبی گھوڑے اُسے چکی کے دو پاٹوں کی طرح گرفت میں لیے بیٹھے ہیں اور اس کی منزل یہاں سے اٹھائیسواں اسٹیشن ہے۔ تیسرے درجے کا یہ مسافر کسی کامپلکس کا شکار نہیں۔ اُس کے ڈبّے میں تو صرف ایک احساس ہی پنپ سکتا ہے اور وہ ہے احساسِ کمتری! صرف ایک رنگ ہی باقی رہ سکتا ہے اور وہ ہے بلب کی کبھی نہ جھپکنے والی آنکھ کا سفید رنگ! صرف ایک کیفیت ہی قائم رہ سکتی ہے اور وہ ہے "جاگتے رہنا بھائی!" کی ازلی و ابدی کیفیت! بھلا اس درجے کے مسافر کو کسی اُلجھن کی زد میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ اپنی جگہ چُپ چاپ بیٹھا خلا میں گھورتا ہے۔ حُقّے کے متوازن اور مسلسل کش لیتا رہتا ہے اور پھر یکایک کسی ایک لمحے جب ریل جھٹکے کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے تو اپنی پوٹلی سر پر رکھتے، اپنے حُقّے اور جُوتیوں کو ہاتھ میں پکڑے، ہینڈل سے لٹک کر نیچے کسی کھائی میں اُتر جاتا ہے اور کالی بھیانک رات بڑھ کر اُسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ تیسرے درجے کا یہ مسافر ایک چھلاوہ ہے ـــــ ایک مست، گونگا اور بے پروا چھلاوہ! ایک ایسا ابوالہول جو ریت پر بنتی بگڑتی ہوئی تحریروں کو صدیوں سے ایک استہزا آمیز منجمد مسکراہٹ میں سے گھورتا آیا ہے اور گھورتا چلا جائے گا۔

دُوسری طرف اُونچے درجے کے مسافر کو خواب دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ خواب تو اُس وقت جنم لیتے ہیں جب آرزوئیں تشنہ رہ جاتی

ہیں۔ یہ مسافر تو سیراب شدہ آرزوؤں اور اُمنگوں کی جنّت کا قیدی ہے۔
گرمی اور حبس سے اسے کوئی سروکار ہی نہیں۔ کیونکہ سائنس کی ایک ہی ادا
نے اُس کے ڈبّے میں خنکی کی ایک کیف آگیں اور معطّر رد یوں پھیلا دی
ہے جیسے شعر میں کوئی خوبصورت تشبیہہ! اُس کا بستر نرم، گداز اور کشادہ
ہے، دیواریں بلّور کی طرح فروزاں اور آئینے معصوم بچّے کی آنکھوں کی طرح
شفّاف اور بے داغ ہیں۔ کھڑکیوں کے شیشے رنگین اور پردے دبیز ہیں۔
وہ چاہے تو باہر کی دُنیا کو بآسانی دیکھ سکتا ہے لیکن باہر کی دُنیا اُسے نہیں
دیکھ سکتی۔ باقی لوازم کی فراہمی مسافر کی صوابدید پر ہے اور اگر اس کی طبیعت
مائل ہو تو کوئی نازک سا شرگیں چہرہ اور تندیِ صہبا سے پگھلا ہُوا کوئی پیمانہ
بھی اس کا ہم سفر ہو سکتا ہے۔ اُونچے درجے کے اِس ڈبّے میں خطرے کے
الارم کی زنجیر تو موجود ہے لیکن دروازہ مُقفّل ہے اور خطرہ کہیں باہر ہی رہ
گیا ہے ——— یہ ایک چھوٹی سی جنّت ہے جس میں مَسرّت خود اپنی تمام
اِضطراری کیفیات سے دست کش ہو چُکی ہے۔ فضا کی خنکی نے جذبات
کو بھی خنک اور جامد کر دیا ہے۔ ہر طرف سکوُن، انجماد اور یکسانیت کا دَور
دورہ ہے۔ وقت رُک چُکا ہے اور وقت کے ساتھ ہی زندگی کا سارا
ہیجان، افکار کی ساری بھیمانہ تندی اور نارسا آرزوؤں کا سارا کہرام بھی
میٹھی نیند سو گیا ہے۔

نچلے درجے کے ڈبے کی حالت اِس سے بظاہر مختلف ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا جہنّم ہے جس میں گرمی اور حبس کا بول بالا ہے۔ مُسافروں کی ریل پیل سے یُوں گُمان ہوتا ہے جیسے کسی دڑبے میں مُرغ بند کر دیئے گئے ہوں۔ پسینے کی بدبُو چاروں جانب پھیل رہی ہے اور اس بدبُو میں حُقّے اور سگرٹ کا دُھواں، نسوار کا غبار، کھانسی کی برقی لہریں اور مُنّھ کے بھبُھوکے ـــ سب کچھ شامل ہو چکا ہے۔ ہوا اِس قدر گرم، بوجھل اور غلیظ ہے کہ نتھنوں کو اسے اندر کھینچنے کے لیے بہت زور مارنا پڑتا ہے لیکن نچلے درجے کا مُسافر اسی ہوا کا طائر اور اسی سمندر کی ایک مچھلی ہے۔ وہ صدیوں سے اِس بوجھل اور گرم ہوا کو سُونگھتا اور اُسے اپنے اندر کھینچتا آیا ہے اور اب اس کے نتھنے اُسے باہر کی ہَوا سے ممیّز کرنے کی صلاحیّت ہی کھو بیٹھے ہیں۔ نچلے درجے کے مسافر کی حسیّات کند ہیں۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر اِس قدر بے حس ہے کہ اگر باہر کی تاریکی سے کوئی خوفناک اور مکرُوہ پنجہ اندر آکر اُس کے ہم سفر کی گردن مروڑ ڈالے تو بھی اِس پر کوئی اثر مرتسم نہ ہو۔ وہ تو اپنے ماحول اور اپنی تقدیر سے کبھی کا سمجھوتہ کر چکا ہے، اِس لیے اب اس کا من شانت، ذہن شقّاف، اور اُس کا بدن بے حس ہے۔ اُونچے درجے کی طرح نچلے درجے کا یہ مُسافر بھی وقت کی بے رحم زد سے قطعاً محفُوظ ہے۔ ایک خوشی

کے ہاتھوں زندۂ جاوید ہو گیا تھا، دُوسرا دُکھ کے ہاتھوں اَمر ہو چکا ہے
اور سچّی بات تو یہ ہے کہ جہنّم بھی ایک قِسم کی جنّت ہی ہے۔ بس ذرا
ٹمپریچر کا فرق ہے!

لیکن درمیانے درجے کا مُسافر نہ جنّت کا باسی ہے اور نہ جہنّم کا!
اس کا مسکن تو ایک عالمِ برزخ ہے۔ اِس مسافر کو اُونچے درجے کا امرت
بھی حاصل ہے اور نچلے درجے کا زہر بھی! لیکن دونوں کی مقدار بس اتنی
ہوتی ہے کہ وہ ایک کی حلاوت اور شیرینی سے ابھی متمتّع نہیں ہو چکتا کہ
دُوسرے کی تلخی اور کڑواہٹ اُسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ وہ
ابھی ہوا کے کسی بھُولے بھٹکے نیم خنک جھونکے سے بمشکل مس ہی کرتا ہے
کہ کوئی غلیظ سا گرم جھونکا آگے بڑھ کر اس سے ٹکرا جاتا ہے۔ اُونچے
درجے کا مُسافر بڑ کے گھنے اور پھیلے ہُوئے چھتنار کے نیچے بیٹھ کر نروان حاصل
کرتا ہے اور نچلے درجے کا مُسافر اس درویش کی طرح ہے جو ہر روز اپنے
بدن کو راکھ ہوتے دیکھتا ہے لیکن اُف تک نہیں کرتا۔ لیکن انٹر کلاس والا
ان دونوں سے مختلف ہے۔ وُہ بیچارہ تو براہِ راست مایا کی طوفانی یلغار
کی زد میں ہے اور مایا کی بیٹیوں نے اسے چاروں طرف سے پُوری
طرح گھیر رکھا ہے۔ ان میں سے جب کوئی اُسے گدگداتی ہے تو وہ ہنس
بڑتا ہے، کوئی چٹکی لیتی ہے تو سی کر کے چُپ ہو جاتا ہے اور کوئی زور

سے کچوکا لگاتی ہے تو بے اختیار رونے لگتا ہے۔ یہ مسافر آنسوؤں اور قہقہوں، خوشیوں اور دکھوں کے جھولے میں ازل سے جھول رہا ہے۔ اور سچّی بات تو یہ ہے کہ صرف اسی شخص کو جنّت اور جہنّم —— دونوں کے ذائقے سے آشنائی ہے۔

آپ پوچھتے ہیں: "انٹر کلاس کے ڈبّے میں کون لوگ سفر کرتے ہیں؟"

"بہت بہت شکریہ! لیکن یہ دروازہ ذرا بند کر دیجیے۔ کہیں بُو کا کوئی گرم جھونکا اندر نہ چلا جائے!"

بس اِتنی سی بات ہے

کل میں نے کوئی پانچ برس کے بعد آئینے میں جھانک کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی اجنبی کوٹ پہنے، ٹائی لگائے، سر کے آخری کناروں سے چمٹی ہوئی سفیدی مائل رُوئیدگی سے بے پروا چہرے اور ماتھے کی گہری خندقوں اور آنکھوں کے نیچے اُبھرے ہوئے گوشت کے حلقوں میں سے مجھے گھور رہا ہے۔ کچھ وقت تو مجھے اس اجنبی کو پہچاننے میں لگا۔ تب اِن آثارِ قدیمہ کے نیچے سے ایک مانوس چہرے کی مدھم سی جھلک دِکھائی دی اور مَیں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا "کیا حال ہے؟" جواب ملا "شکرِ ذوالجلال ہے!" مَیں نے کہا "وہ جو ایک شخص خود بخود دل میں سمایا رہتا تھا، اُس کا کیا بنا؟" اب میں اجنبی نے مسکرا کر کہا "دیکھتے نہیں ہو، ڈھل گیا!"——

"ڈھل گیا!" میں نے حیران ہوکر پوچھا "کس میں ڈھل گیا؟" اجنبی پھر مسکرایا۔ ایک انتہائی کرب آمیز اور طنزیہ مسکراہٹ اُس کے سارے چہرے پر پھیل گئی۔ تب وہ بولا "بھائی صاحب! حیران کیوں ہوتے ہو؟ وُہ بے چارہ ہزار سانچوں میں سے ایک میں ڈھل گیا۔ ڈھلنا مقدّر جو ٹھہرا۔ میرے ہونٹ ایک نہایت اہم سوال کو لفظوں میں متشکّل کرنے کے لیے کپکپائے، لیکن اس سے پہلے کہ میرا سوال لفظوں کے سانچے میں ڈھلتا، میری بیوی نے آئینہ میرے ہاتھ سے چھین کر پرے پھینک دیا۔ بولی "بوڑھے ہوگئے، لیکن آئینہ دیکھنا نہ گیا۔ کوئی پوچھے، اب اس میں رکھّا ہی کیا ہے! میں تو اسے ہاتھ بھی نہ لگاؤں!"

ہر عورت فطرتاً ایک رابعہ ہے اور اُسے مرد سے کہیں پہلے عرفان حاصل ہوجاتا ہے۔ مرد بے چارہ تو چاند کی ایک جھلک پاتے ہی جذبات کے جوار بھاٹے میں ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیتا ہے۔ جبکہ عورت انتہائی جذب کی حالت میں بھی خود آگاہی اور خود شناسی کی بے پایاں دولت سے سرفراز رہتی ہے۔ پھر اُسے آنے والے زمانے کے گہرے لانبے سایوں کا احساس بھی تو نسبتاً جلد ہوجاتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ میری بیوی کو بھی پہلے ہی چاندی ایسے سفید بال کی آمد پر عرفان حاصل ہوگیا جبکہ میں آہستہ آہستہ ایک ایسی کیفیت میں مبتلا ہوتا گیا جس کے

آخر میں ایک گرد آلود آئینہ ایک اجنبی سا تھکا تھکا چہرہ اور انکشاف کا ایک کرب انگیز لمحہ ایستادہ تھا۔

اور اب میری بیوی کہتی ہے "آئینے میں رکھا ہی کیا ہے"؟ لیکن شاید آئینے میں ابھی بہت کچھ رکھا ہے۔ مثلاً اگر میں کل آئینے میں جھانک کر نہ دیکھتا تو مجھے کون بتاتا کہ میں اب پارے کی طرح سیّال اور آگ کی طرح فروزاں شے نہیں رہا بلکہ دل کی خنکی اور زمانے کی برفاب ہوا نے مجھے ایک سخت، جامد اور ٹھہری ہوئی شے میں متبدل کر دیا ہے۔ سیّال مادّے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ ذرا سی حرکت بلکہ خفیف سی لرزش بھی اُسے بدل کر رکھ دیتی ہے۔ کوئی کنارا، کوئی دیوار، کوئی ضابطہ اُس کے راستے میں بند نہیں باندھ سکتا۔ بعض لوگ شاید یہ کہیں کہ دریا کے پانی کو کناروں نے جو روک رکھا ہے، یہ کیا بات ہے؟ جواب یہ ہے کہ پہاڑوں پر برکھا کی ذرا سی رحمت نازل کر دو اور میدان میں کناروں کے ٹوٹنے کا عمل مفت میں دیکھ لو۔ پھر اگر اس بات کی فلسفیانہ توجیہہ مطلوب ہو تو یونانی مفکّرین سے رجوع کرو جو دریا کو جامد مانتے ہی نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے، اس ایک لمحے میں تُم نے جس دریا کو دیکھا، وہ اب کہاں ہے؟ پُل کے نیچے پانی کی صورت ہر لحظہ تبدیل ہو رہی ہے۔ پانی تو وقت کی طرح ہے، ہر دم رواں، ہر دم

رواں! پانی رُکے تو برف کی ایک قاش بن جائے اور وقت رُکے تو چہرے کی گہری خندقوں، آنکھوں کے نیچے گوشت کے اُبھرے ہُوئے حلقوں اور سر کے آخری کناروں سے چمٹی ہُوئی سفیدی مائل زردیدگی میں ڈھل جائے۔ آئینے میں دیکھتے ہی مجھے محسُوس ہوا ہے جیسے مَیں برف کی ایک قاش اور رُکا ہوا ایک لمحہ ہوں۔ کبھی مَیں بھی سیال وقت کی ایک ایسی رَو تھا جو دشت و جبل اور بحروبر کو عبُور کرتی بڑھے ہی چلی جاتی تھی، لیکن اب وہ بات کہاں؟ سیال مادہ کبھی لوہے کے کسی سانچے میں قطرہ قطرہ گرا ہوگا۔ اس کے بعد زمانے نے اُسے آگ کے قریب نہیں آنے دیا۔ پہلے اُس کی سطح پر پپڑی سی جمی، پھر یہ آہستہ آہستہ اندر سے ٹھنڈا ہوتا گیا اور آخر سانچے کی عطا کردہ صُورت میں پُوری طرح ڈھل گیا۔ گویا جو خود کبھی وقت تھا، اب وقت کی زد میں ہے۔ ہوا کا ہر تھپیڑا اُسے ٹھکرا کر آگے کو بڑھ جاتا ہے، لیکن لوہے کی یہ گیند اب ہر قسم کے احساس سے عاری ہے۔

عجیب بات ہے، جب جوانی کی مُنہ زور ندی چڑھتی ہے، انگ انگ تھرکتا ہے اور آنکھیں نشے میں ڈُوب کر آئینے کی تلاش کرتی ہیں۔ یعنی جب انسان خود اپنے جسم کی لازوال سُندرتا اور اپنے لہُو کے طلسم میں گم ہو جاتا ہے تو پھر وہ باہر کی دُنیا کو پرِ کاہ سے زیادہ اہمیّت

نہیں دیتا۔ جوانی مجسّم بغاوت ہے اور ہر جوان ایک الگ داستان ہے۔ اِس داستان کو آپ کسی بنی بنائی کہانی کا عنوان نہیں بنا سکتے۔ یہ تو ایک طوفانی ندی ہے جو اپنا راستہ خود بناتی ہے۔ پتھروں کو ہٹا کر، درختوں کو اُکھیڑ کر، چٹانوں کو توڑ کر اپنے اندرونی اُبال کے تحت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ جوانی کو پامال راہوں اور پتھر کی دیواروں میں گھِرے ہُوئے آج تک کسی نے نہیں دیکھا! یہ تو ایک ایسی خوشبو ہے، جو لہُو کے معمولی سے مدّ و جزر پر بھی ڈولنے لگتی ہے۔

لیکن پھر دیکھتے دیکھتے لہُو ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور جسم کی تڑپ، نیز رُوح کی کلبلاہٹ سانچے میں مقیّد ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد کہیں سے خنک ہوا کا ایک جھونکا نمودار ہوتا ہے جو سیّال مادے کو منجمد کر جاتا ہے۔ گلاب ایسے بے داغ چہرے پر پنجاب کے پانچوں دریا اُبھر آتے ہیں۔ ردِّ عمل میں ایک خاص میکانکی نظم و ضبط اور ایک مخصُوص ٹھہراؤ در آتا ہے۔ حتّٰی کہ لباس، چال اور اندازِ گفتگو بھی ایک خاص نمُونے میں ڈھل جاتا ہے۔ گویا جو شخص کبھی اپنی ذات میں ایک انجمن تھا، اب انجمن کا ایک حقیر فرد ہے اور اُس کی شکل و صُورت، وضع قطع اور اندازِ نظر خود انجمن نے اپنی اکیڈمی یا کارخانے میں ایک خاص ضابطے کے تحت ازسرِ نَو مرتّب کیا ہے۔ پہلے یہ شخص ایک

کردار تھا، اب وہ ایک ٹائپ ہے۔ لیکن ڈھلنے کا یہ عمل اس قدر آہستہ رو ہوتا ہے کہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ ایک بھلا چنگا آدمی جس کی باتوں میں ایک عجیب رس اور جس کے انداز میں ایک انوکھی تازگی تھی کب اپنی ان صفات کو ترک کر کے مشین کا ایک پرزہ بن گیا۔ ہاں اگر درمیان میں فراق کا ایک طویل وقفہ حائل ہو جائے تو تبدیلی کا ایک گہرا احساس دل کو ضرور کچوکا لگائے بعینہٖ جیسے آئینے میں جھانکتے ہی میرے دل پر چوٹ پڑی ہے۔ ویسے مجھے اپنی زندگی میں ہر بار ایک صدمے سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ جب میں نے دیکھا ہے کہ کردار قطعاً غیر ارادی طور پر ٹائپ میں مبدّل ہو گیا۔ مثلاً جب میرا دوست م کالج میں تھا تو کس قدر زندہ دل، بے پروا اور ہر ضابطے سے بے نیاز تھا۔ گھنٹوں اُس نے میرے ساتھ مل کر معاشرے کو بدلنے کے پروگرام بنائے اور خدا سے لے کر جمہوریت تک ہر چیز کی نفی کرنے کی کوشش کی۔ پھر کالج کے ایام ختم ہو گئے۔ زمانے کی ایک ہی موج نے اُسے کہیں اور مجھے کہیں پہنچا دیا۔ درمیان میں بیس پچیس گرد آلود سال حائل ہو گئے۔ پھر شومیٔ قسمت سے مجھے کسی روز پھلّر وان، چیچو کی ملیاں یا کالا شاہ کاکو جانا پڑا اور وہاں کسی بوریے کا گھونگھٹ نکالے ہوئے ہوٹل، چیچک زدہ سڑک یا کسی مریل سی دکان پر میں نے اپنے اس جگری

دوست کو دیکھا اور بمشکل اُسے پہچانا۔ اب وہ حاجی صاحب تھے۔ لمبی داڑھی، شانے پر رومال، آنکھوں میں سُرمہ، ماتھے پر ایک گہرا گھاؤ۔ لیکن وُہ مضطرب، ذہین اور باغی نوجوان کہاں گیا۔ ادرم ایسے دُوسرے ل، و، س اور ض کہاں چلے گئے؟ کوئی خان بہادر ہے، کوئی چُنگی محرّر ہے، کوئی زمیندار ہے، کوئی ساہُو کار ہے، کسی نے مجسٹریٹ، تھانیدار یا پروفیسر کا لباس پہن لیا ہے اور کوئی بے یار و مددگار ہے، لیکن ان سب کی ذہنیت سماج کے بنائے ہُوئے چھوٹے چھوٹے سانچوں میں ٹھنڈی ہو کر ایک مخصوص صُورت میں بدل چکی ہے۔ ہر سانچے کا ایک مزاج ہے اور وہ اپنے اس مزاج کو ٹھنڈے ہوتے ہُوئے مادّے میں اس خوبصُورتی سے منتقل کر دیتا ہے کہ جب بُت ڈھل کر سامنے آتا ہے تو آپ اس سانچے سے نکلے ہُوئے لاکھ دُوسرے بُتوں سے اسے متمیز کر ہی نہیں سکتے۔ یہی سانچے کا کمال ہے کہ وُہ شعلے کو بجھاتا، بغاوت کو کچلتا اور انفرادیت کا قلع قمع کر دیتا ہے اور سیّال شے کو ٹھنڈا کر کے ایک بُت میں بدل دیتا ہے۔ یہ بُت اب اپنے خاص گروہ کی اجتماعی ہیئت کی ایک تصویر ہے ـــــ لوگ اس دارِ فانی میں آتے ہیں اور چند روز یہاں گزار کر فنا کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں، لیکن سانچے سے نکلا ہُوا یہ بُت ازلی و ابدی ہے۔ آپ

اسے ہر زمانے میں دیکھ سکتے ہیں۔

مگر شاید سانچہ کہیں باہر سے نازل نہیں ہوتا بلکہ ہر شخص اپنا سانچہ اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ شروع شروع میں جب خون کی حدت تیز تھی تو یہ سانچہ اپنا کام بخوبی سرانجام دینے سے معذور رہا، لیکن جب سورج نصف النہار سے نشیب کی طرف لڑھکا تو سانچہ گویا گرم ہو گیا اور آپ بڑی خاموشی سے اس میں ڈھلتے چلے گئے۔ اب اگر آپ کے سر پر بھاری عمامہ اور منہ پر داڑھی ہے، اگر آپ کے گلے میں تعویذ اور مزاج میں جھلاہٹ ہے یا آپ ڈھیلی ڈھالی اچکن میں ملبوس نیچے چلے جا رہے ہیں تو اس میں میرا یا میرے سماج کا بھلا کیا قصور ہے؟ یقین جانیے، سماج تو آپ کے اندر ہے۔ اُس نے ذرا دیر کے لیے اپنے پنجے کی گرفت ڈھیلی کی تھی کہ آپ پھدک کر پنجرے کے دروازے میں آ کھڑے ہوئے۔ اب اس نے دوبارہ آپ کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ بس، اتنی سی بات ہے!

فُٹ پاتھ

جب سُرخ ساڑھی میں لپٹی ہُوئی شام آسمان کے بام و در سے لحظہ بھر کے لیے جھانکتی ہے تو میں چھڑی ہاتھ میں لیے گنجان سڑک سے چمٹے ہُوئے فُٹ پاتھ پر چہل قدمی کے لیے نکل آتا ہُوں۔ اس اُمّید کے ساتھ کہ شاید میں آج اِس حسینۂ فلک کے درشن کر سکوں، لیکن آسمان سے آنکھ مچولی کھیلتی ہُوئی دیواروں کے اِس شہر میں میری نظریں اُس تک پہنچ ہی نہیں پاتیں۔ اس کے بجائے میں اس سیہ پوش بپھرے ہُوئے جمِّ غفیر کا نظّارا کر کے لوٹ آتا ہُوں جو میرے دائیں ہاتھ بہتی ہُوئی سڑک پر سائیکلوں، تانگوں، موٹروں، سکوٹروں اور رکشاؤں کی صُورت میں رواں دواں ہے۔ اُس وقت مجھے یُوں لگتا ہے جیسے میں کسی تیز رفتار پہاڑی دریا کے کنارے یا متلاطم سمندر میں گھِرے ہُوئے کسی خاموش اور تنہا جزیرے میں کھڑا سرکش موجوں کا

نظّارہ کر رہا ہُوں - یہ منظر اُس محرُومی کی بدرجۂ اتم تلافی کر دیتا ہے جو شام کے درشن نہ ہو سکنے کے باعث میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی -

اکثر لوگ سڑک اور فُٹ پاتھ میں تمیز نہیں کر سکتے - اُن سے پُوچھیے تو وہ یہی کہیں گے کہ سڑک تیز رفتار ٹریفک کے لیے مختص ہے اور فُٹ پاتھ پیدل چلنے والوں کو الاٹ کر دیا گیا ہے - گویا فُٹ پاتھ دراصل سڑک ہی کا ایک مختصر رُوپ ہے - دُوسرے لفظوں میں بقول ایک مشہور ادبی نقّاد ان میں صرف ہیئت کا فرق ہے - میری رائے میں اِس سے زیادہ غلط بات اور کوئی نہیں ہو سکتی، کیونکہ سڑک اور فُٹ پاتھ جنس کے اعتبار سے بھی ایک دُوسرے سے مُختلف ہیں، بلکہ طبعًا اور مزاجًا تو ایک دُوسرے کی ضد ہیں - مثلاً سڑک میں مرد کی سی بے قراری اور سیماب پائی ہے - اُس پر چلتی ہُوئی مخلُوق، تخلیقی جرثُومے کی طرح ایک ازلی اور ابدی بے قراری میں اسیر اور آگے بڑھنے اور ٹکرانے کی ایک شدید آرزُو میں سرشار ہے - اس کی منزل کون سی ہے اور وہ کون حریف ہے جس سے یہ بالآخر ٹکرائے گی - اس بات کی نہ تو اس مخلوق کو کوئی خبر ہے اور نہ پروا ! اس کا کام تو "چل چل رے نوجواں" کی عملی تفسیر پیش کرنا ہے اور بس ! دُوسری طرف فُٹ پاتھ عورت کی طرح چنچل، ملائم اور سُست گام ہے - وُہ سڑک کے جذباتی فشار کو ایک معنی خیز مُسکراہٹ سے دیکھتا ہے - اُس کی بے قراری اور

شوریدہ سری سے محظوظ ہوتا ہے اور ایک نگاہِ غلط انداز سے اس کی ہر کروٹ کو مسترد کرتا چلا جاتا ہے۔ فٹ پاتھ سدا اُس دُور دیس سے آنے والے کی راہ دیکھتا ہے، جو سڑک کے کسی برق صفت اُڑن کھٹولے سے اُتر کر اس کی معطر تنہائیوں میں ایک روز داخل ہوگا اور پھر اسی خوابناک جزیرے کا ہو کر رہ جائے گا۔ اسی لیے فٹ پاتھ میں ٹھہراؤ ہے، ترغیب ہے، سکون اور آرام ہے اور یہ سڑک کے جلے جھلسے ہوئے مسافروں کے لیے ایک ایئر کنڈیشنڈ ریستوران کا درجہ رکھتا ہے۔

سڑک اور فٹ پاتھ کا یہ فرق مکانی سطح پر تو خیر لیکن زمانی سطح پر بہت زیادہ ہی واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً سڑک کا مسافر وقت کی ایک سمت میں ناک کی سیدھ بڑھتا ہے اور دُوسری تمام سمتوں کو لحظہ بھر کے لیے بھول جاتا ہے جب کہ فٹ پاتھ کا باسی اس ایک سمت سے قطع تعلق کر کے دُوسری سمتوں کو اپنے سینے سے چمٹائے رکھتا ہے۔ اس عبارت کی گرہ کشائی یوں ہو سکتی ہے کہ جب آپ سڑک پر چلتے ہیں تو مستقبل لپک کر آپ کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے اور آپ اپنے سکوٹر، سائیکل یا موٹر پر بیٹھے مستقبل کے اِس بے نشان صحرا میں تیز رفتاری سے بڑھنے لگتے ہیں یا شاید یوں ہوتا ہے کہ وقت کا عفریت عقب سے آ کر آپ کو دھکا دیتا ہے اور اگر سامنے کوئی چیز نمودار ہو کر آپ کی اس یلغار کو کامیابی سے نہ روک سکے (رکاوٹ کی

صُورت میں قوی امکان یہ ہے کہ آپ ابدی طور پر رُک جائیں گے) تو آپ کی مُستقبل کوشی کا یہ رُجحان تیز سے تیز تر ہوتا چلا جائے گا اور آپ چند ہی لمحوں میں ہوا میں تحلیل ہو کر نظروں سے غائب ہو جائیں گے۔ دِلچسپ بات یہ ہے کہ سڑک اپنی ابتدا تو زمین سے کرتی ہے اور اس کام کے لیے سکوٹر، موٹر اور اسی قبیل کے دُوسرے ارضی آلات کو بُروئے کار لاتی ہے لیکن جب ایک خاص مرحلے کے بعد اسے پَر عطا ہو جاتے ہیں تو یہ جہازوں اور راکٹوں کے ذریعے خلا کی طرف بڑھ کر اس میں یُوں ضم ہو جاتی ہے کہ جسم سے اس کا تعلق ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے صُوفیا نے اس یلغار کو معرفت اور نروان کا نام دیا ہے۔ مگر مجھ ایسے رجعت پسند دُنیا دار کی نظروں میں اگر اس کا نام فنا یا موت بھی رکھ دیا جائے تو اس میں قطعاً کوئی ہرج نہیں —— آخر اپنا اپنا زاویۂ نگاہ ہر کسی کو عزیز ہے!

مگر فُٹ پاتھ کو سڑک کے اس مستقبل سے کوئی سروکار نہیں اور اسی لیے اس نے اُن تمام شیطانی آلات کو نفرت کی نظروں سے دیکھا ہے جو اسے مستقبل کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ فُٹ پاتھ کا باسی تو 'حال' کے لمحے کا بے تاج بادشاہ ہے اور اگر وہ چہل قدمی بھی کرتا ہے تو صِرف ماضی کی سمت میں! اور ماضی کی جانب چہل قدمی کرنے کے لیے کسی سکوٹر یا موٹر کی ضرورت نہیں۔ صِرف ہلکی ہلکی نیم گرم سی

یادوں کی ہمراہی درکار ہے۔ متلاطم سمندر کی طرف سے آنکھیں بھینچ کر اور کان بند کر کے وُہ یکایک ایک اُلٹی زقند لگاتا ہے اور ماضی کے اُن مرغزاروں میں جا نکلتا ہے، جہاں ہر شے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وقت کی چٹانوں پر نقش ہو چکی ہے۔ وہ اِس تاریک البم کو آہستگی سے کھولتا ہے اور ایک خُفیہ ٹارچ کی روشنی میں اس کی ایک ایک تصویر کو دیکھنے لگتا ہے۔ یہ تصاویر کیا ہیں؟ ــــــ وقت کے منجمد لمحات! ان میں سے ہر لمحہ پابندِ سلاسل کر لیا گیا ہے اور اب کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ البم تیار کرنے والے نے صرف خُوبصورت تصویروں کا اِنتخاب کیا اور دُکھ دینے والی مُورتوں کو کہیں دُور پھینک دیا اور اب یہ البم مُسرّت بھرے لمحات کا ایک درخشندہ ہار ہے جسے فُٹ پاتھ کا باسی اپنے گلے میں پہن کر سڑک کے شور و شغب سے محفُوظ ہو جاتا ہے۔ دراصل اِس البم سے لُطف اندوز ہونے کے لیے فُٹ پاتھ کا خاموش اور پُرسکون دیار ہی موزُوں ترین جگہ ہے ورنہ سڑک پر اگر اِس البم کو کھولیں تو ورق ورق ہو کر ہوا میں اُڑ جائے۔

مگر فُٹ پاتھ کا اصل یارِ غار تو حال کے لمحے کا وُہ ساغر ہے جو اُس کے ہاتھ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تھما دِیا گیا ہے۔ فُٹ پاتھ کا مُسافر ہتھیلی پر دھرے ہُوئے اِس لبالب پیالے سے گھُونٹ گھُونٹ امرت چکھتا ہے اور

زندۂ جاوید ہو جاتا ہے۔ مسرت مستقبل کی چیز نہیں، کیونکہ مستقبل تو فریبِ نظر ہے۔ یہ تو حال کے لمحے کا وہ گلاب ہے، جسے آپ اپنے کوٹ کے کالر میں سجا لیتے ہیں اور اپنے حساس نتھنوں سے اس کی دلفریب گاڑھی خوشبو سونگھتے چلے جاتے ہیں۔ فٹ پاتھ کے بعض ازلی دشمن اس خوشبو کے طلسم کو توڑنے کے لیے جگہ جگہ غلیظ دکانیں کھول کر فٹ پاتھ کے باسیوں کو ورغلانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ایک تجربہ کار "فٹ پاتھیا" کبھی کسی ترغیب یا تحریص کی زد میں نہیں آتا اور ان کھولیوں کے قریب سے یوں گزر جاتا ہے جیسے روپیہ نادار کی جیب سے! ان دکان داروں میں سے ایک مخلوق تو "نجومی" کہلاتی ہے اور فٹ پاتھ والوں کو روک کر مستقبل کے رنگین خواب دکھانے کی کوشش کرتی ہے۔ نجومی کے ماتھے کی ریکھوں پر "وقت کے ساتھ ساتھ تقدیر بھی بدلتی رہتی ہے" کے درخشاں الفاظ کندہ ہوتے ہیں اور نجومی آپ کا ہاتھ تھام کر آپ کو تقدیر کی متلون مزاجی کا منظر دکھانے لگتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اس مخلوق کو سخت خوف اور نفرت کی نظروں سے دیکھا ہے اور ہمیشہ اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھ گیا ہوں۔ دوسری مخلوق "بھکاری" کہلاتی ہے اور اپنے اصلی یا نقلی زخموں کی نمائش سے ہر رہرو کو مستقبل کا خوف دلا کر اس کی جیب خالی کرا لیتی ہے۔ یہ مخلوق بھی فٹ پاتھ کی مخصوص خوشبو کی ازلی دشمن ہے

اور ایک خاندانی فُٹ پاتھیا کبھی اِس سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔
فُٹ پاتھ کے یہ ازلی دُشمن دراصل محض حملہ آور ہیں جو لُوٹ مار کرنے کے بعد واپس اپنے پہاڑی بسیروں میں جا چھپتے ہیں، مگر اُن لوگوں کو آپ کیا کہیں گے جو باسی تو فُٹ پاتھ کے کہلاتے ہیں، لیکن جنھیں نہ تو فُٹ پاتھ سے محبّت ہے اور نہ جو اِس کی لطیف خوشبو سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیّت ہی رکھتے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا جہاز سڑک کے متلاطم سمندر میں تباہ ہو گیا تھا اور وہ کسی ٹُوٹے ہُوئے تختے پر بیٹھ کر فُٹ پاتھ کے جزیرے میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ یہ محض تباہ حال مُسافر ہیں اور اُس دِن کے اِنتظار میں ہیں جب فُٹ پاتھ کے ساحل پر کوئی جہاز لنگر انداز ہو گا اور یہ بڑی خوشی سے اُس میں بیٹھ کر دوبارہ سڑک کی دُنیا میں کھو جائیں گے۔ ایسے لوگ فُٹ پاتھ کے باسی نہیں، ریلوے پلیٹ فارم پر بیٹھے ہُوئے مُسافر ہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی جیب تراش کی خدمات حاصل کر کے دیکھ لیجیے۔ ان کی جیبوں سے اگر بجز ٹکٹ کوئی اور شے برآمد ہو تو میرا ذمّہ!

کچھ قلم کے بارے میں

قلم کی قلمرو کس قدر وسیع ہے، اس کا اندازہ اِس بات سے لگایئے کہ قلم کا لفظ قلمکار کے غلیظ ہاتھوں تک ہی محدود نہیں، بلکہ بعض اوقات مالی کی صاف ستھری اُنگلیوں اور کبھی کبھار باربر کی چاق وچوبند پوروں تک بھی جا پہنچتا ہے۔ لیکن مَیں اِس وقت نہ تو آپ سے آم کے قلم کا ذِکر چھیڑنے کا آرزومند ہوں (ہرچند کہ یہ ذکر بہت لذیذ ہوگا) اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ اُس مقراض کا ذِکر کروں جو آپ کے کانوں کے گرد کسی بھُوکی چڑیا کی طرف "کچ کچ" کرتی منڈلاتی رہتی ہے اور جب رہ نہیں سکتی تو آپ کے بالوں کے قلم کو تیز چونچ سے ہلکا سا کچوکا لگاکر دوبارہ کچ کچ کا وِرد کرتی پھدکتی چلی جاتی ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ آپ پر تیز چونچ سے حملہ آور ہونے کے بعد اِس کچ کچ

میں فتحمندی اور وقار بھی شامل ہو جاتا ہے، جیسے وہ کہہ رہی ہو ـــ
"یہ سب میرا مفتوحہ علاقہ ہے۔ میں جب چاہوں اور جسے چاہوں، اپنا تختۂ مشق بنا سکتی ہوں"۔ لیکن فتحمندی کا یہ احساس کچھ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہتا اور بھوک جلد ہی اس پر غالب آ جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے بھوک کا کچ کچ کے سہانے نغمے سے کوئی پرانا اور اٹوٹ رشتہ ہے۔

لیکن میں اِن تہذیب سے نا آشنا قلموں کا ذکر کر کے آپ کے لطیف اور ارفع ذوقِ نظر کو مجروح کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میرا موضوع تو صرف وہ قلم ہے جسے تقدیر نے میری انگلیوں میں اڑس دیا ہے اور جو اب اِن انگلیوں کے ہلکے سے دباؤ یا اشارے پر حروف کو جوڑ کر لفظوں اور لفظوں کو جوڑ کر ننھے مُنّے جملوں میں ڈھالتا ہوا کاغذ کے طویل و عریض دالان میں اپنی جولانیاں دکھاتا چلا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، میں نے یہ قلم ایک کباڑیے کی دکان پر دیکھا تھا اور اسے دیکھتے ہی میں اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ کباڑیے کے پاس کچھ اور نادر و نایاب چیزیں بھی تھیں، مثلاً لوہے کے پرانے خود، پھٹی ہوئی فوجی وردیاں، شکستہ ٹائر، ٹوٹی ہوئی گاڑیوں کے ڈھانچے اور پانی کی زنگ آلود ٹونٹیاں وغیرہ اور میں بڑی آسانی سے اِن چیزوں کا ایک

ایک نمونہ اپنی تحویل میں لے کر اپنے نانا جان مرحوم کی عظمت اور بہادری کی داستانوں کو اِس "زندہ ثبوت" سے مستحکم کر سکتا تھا، لیکن اُس وقت بدقسمتی سے میری جیب کچھ تنگ تھی (جو کوششِ بسیار کے باوجود ابھی تک کشادہ نہیں ہو سکی)۔ اِس لیے مَیں نے اپنے ارمانوں کا فی الفور گلا گھونٹ دیا اور قلم کے حسین پیکر پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کر دی اُدھر کباڑیا بھی کوئی خاندانی کباڑیا تھا۔ فوراً میری نیت کو بھانپ گیا اور قلم کی قیمت میں پورے پچاس پیسے کا اضافہ کرتے ہوئے گویا ہوا ——— "جناب! یہ کوئی عام سا قلم نہیں! خدا کی قسم، مَیں نے یہ قلم پھٹتے ہوئے بموں میں سے گزر کر ایک مرے ہوئے سکھ میجر کی جیب سے نکالا تھا۔ خدایا، کس قدر بھیانک تھا وہ سماں! مَیں جب ———" لیکن مَیں نے کباڑیے کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اُس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر پورے ایک روپے کی ریزگاری سجا دی اور قلم اپنے کوٹ کی بیرونی جیب پر چسپاں کر کے تیز تیز قدم اُٹھاتا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اور اب یہ قلم ایک عرصہ سے میری تنہائیوں کا واحد مونس اور غمگسار ہے اور میری قلمرو میں دن رات اضافے کی فکر میں رہتا ہے۔ مجھے اِس کی یہ ادا بہت پسند ہے کہ یہ خودکار ہے اور اِس میں ایک عجیب سا وقار اور قلندری بھی ہے، جیسے کہہ رہا ہو ——— "قبلہ! میں

کوئی دریوزہ گر نہیں کہ در در کی بھیک مانگوں یا ایک ہی در پر بار بار حاضری دُوں۔ مَیں تو ایک مست فقیر ہُوں، جسے کسی دروازے کی حاجت نہیں"۔۔۔۔ اس کے بعد وُہ پریم بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا ہے اور آگے بڑھنے کے لیے مچلنے لگتا ہے۔ معًا مجُھے اپنا وہ قلم یاد آجاتا ہے جو اب میز کی دراز کے کسی گمنام گوشے میں دبکا پڑا ہے، لیکن جو نئے قلم کی آمد سے پہلے مجُھ پر پُوری طرح مُسلّط تھا۔ "مُسلّط" مَیں نے اس لیے کہا کہ مجھے اس کی یاری ہرگز پسند نہیں تھی۔ اُس کی فطرت میں دریوزہ گری تو گویا کُوٹ کُوٹ کر بھری ہُوئی تھی۔ جب مَیں اُسے کچھ لکھنے کی فرمائش کرتا تو وہ ٹھمک کر نیند سے بوجھل آواز میں کہتا۔۔۔۔ "پہلے میرا مُنہ ہاتھ تو دُھلاؤ۔ ابھی ابھی جاگا ہُوں۔ ہوش میں آؤں تو چلوں۔۔۔۔" پھر جب چلنے کا مرحلہ آتا تو کہتا "دوات سے ایک بوند روشنائی تو دلا دو!" میں دوات کی مِنّت سماجت کر کے اُسے ایک بوند روشنائی دلا دیتا تو ایک ہی سطر لکھ کر رُک جاتا، کہتا "وُہ تو ختم ہو گئی، کچھ اور دلا دو نا"۔ دو چار سطروں کے بعد میں خُود میں مزید دریوزہ گری کی سکت نہ پا کر جب صاف انکار کر دیتا تو وُہ از خُود لڑھکتا لڑکھڑاتا دوات کے در پر پیشانی رگڑنے کے لیے حاضر ہونا شروع ہو جاتا اور ہر بار اُس کی انکساری، گڑگڑاہٹ، چاپلوسی اور خوشامد میں اضافہ ہونے لگتا اور ابھی بمشکل ایک صفحہ ہی سیاہ ہو پاتا کہ

وُہ ہر لفظ کے بعد دوات کے حضور میں پہنچنے لگتا۔ کہتا "ہے کالی ماتا! تو جُگ جُگ جیے! تیری شکتی پُورب سے پچھم تک پھیلے! ہے بھاگوان! سادھو سنت کو دان دے کہ دان نہ دینے سے دھن دولت گھٹ جاتی ہے۔ کالی ماتا! تیرا قلم سارے سنسار پر راج کرے (شرما جاتا) نہ تو خود راج کرے۔ میرے حلق میں ایک بُوند روشنائی ٹپکا دے! ٹپکا دے کالی ماتا!" —— اور کالی ماتا؟

اور کالی ماتا قدم قدم پر گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی۔ کبھی جب اُس کا مزاج برہم ہوتا تو نب کے ماتھے پر گرم گرم روشنائی کا پلستر کر دیتی اور بے چارہ قلم شیشے میں پھنسی ہوئی مکھّی کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگتا۔ پھر جب وُہ کنجوُسی کے موڈ میں ہوتی تو قلم اپنا سا مُنہ لے کر واپس آ جاتا۔ اور اُس کا نب کاغذ پر کچُھ لکھنے کے بجائے اسے مجرُوح کرنے لگتا۔ کبھی کبھی کالی ماتا پر رِقت سی طاری ہو جاتی۔ وُہ ساون کی برکھا کی طرح ایک تار پر روتی چلی جاتی، اُس کا رنگ پھیکا پڑ جاتا اور کاغذ کے علاوہ میری اُنگلیوں پر بھی غلیظ سے دھبّے اُبھر آتے —— عجیب مزاج تھا اُس کا! مگر اب وُہ بھی دراز کے کسی گُمنام گوشے میں سر بسجوُد پڑی ہے۔ اُس کا باطن خُشک ہو چکا ہے، آنکھیں بے نُور اور لب سِل چکے ہیں۔ اب کوئی سادھو اُس کے در پر سنکھ بجانے کے لیے نہیں آتا۔ ہاں، جب کبھی

رلسے دراز کھلنے کی آواز سُنائی دیتی ہے تو اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی لرزش ضرور نمودار ہو جاتی ہے، جیسے کہہ رہی ہو —— "راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا!"

پُرانے قلم اور اس کی کالی ماتا سے مجھے اب کوئی غرض نہیں۔ وہ تو بُجھا ہُوا ماضی ہے اور بُجھے ہوئے ماضی کی اور جانا مجھے کسی صورت بھی منظور نہیں۔ میں تو اب اپنے نئے قلم کی ہمراہی میں خوش باش زندگی گزار رہا ہوں۔ یہ ایک خود کار قلم ہے جو کسی دُوسرے کا دست نگر نہیں۔ وہ زمانہ اب گیا جب انفرادیت کو خوف اور غُصّے کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اب تو ہر شخص اپنے قدموں پر خود کھڑا ہے۔ یہی حال میرے اس قلم کا بھی ہے۔ اس کی گزر اوقات اب اُس لقمے پر نہیں، جس کے لیے کسی در پر حاضری دینا ضروری ہے، بلکہ اُس گرم اور تازہ خون پر ہے جو اس کی رگوں میں دیوانہ وار دوڑتا ہے۔ جب تک یہ خونِ گرم موجود ہے، میرے قلم کی جولانیاں بھی جاری ہیں۔ مجھے اپنے اس قلم پر ناز ہے جو پہاڑ دل کی چٹانوں کو صفحۂ قرطاس بنا کر ان پر لکھتا ہے اور جو چیونٹی کی طرح اپنا رزق خاکِ راہ میں تلاش نہیں کرتا بلکہ اسے اپنے کوہان سے کشید کرتا ہے اور اس کے بعد گرمی اور لُو کی پروا کیے بغیر دشت نوردی میں مُبتلا ہو جاتا ہے۔